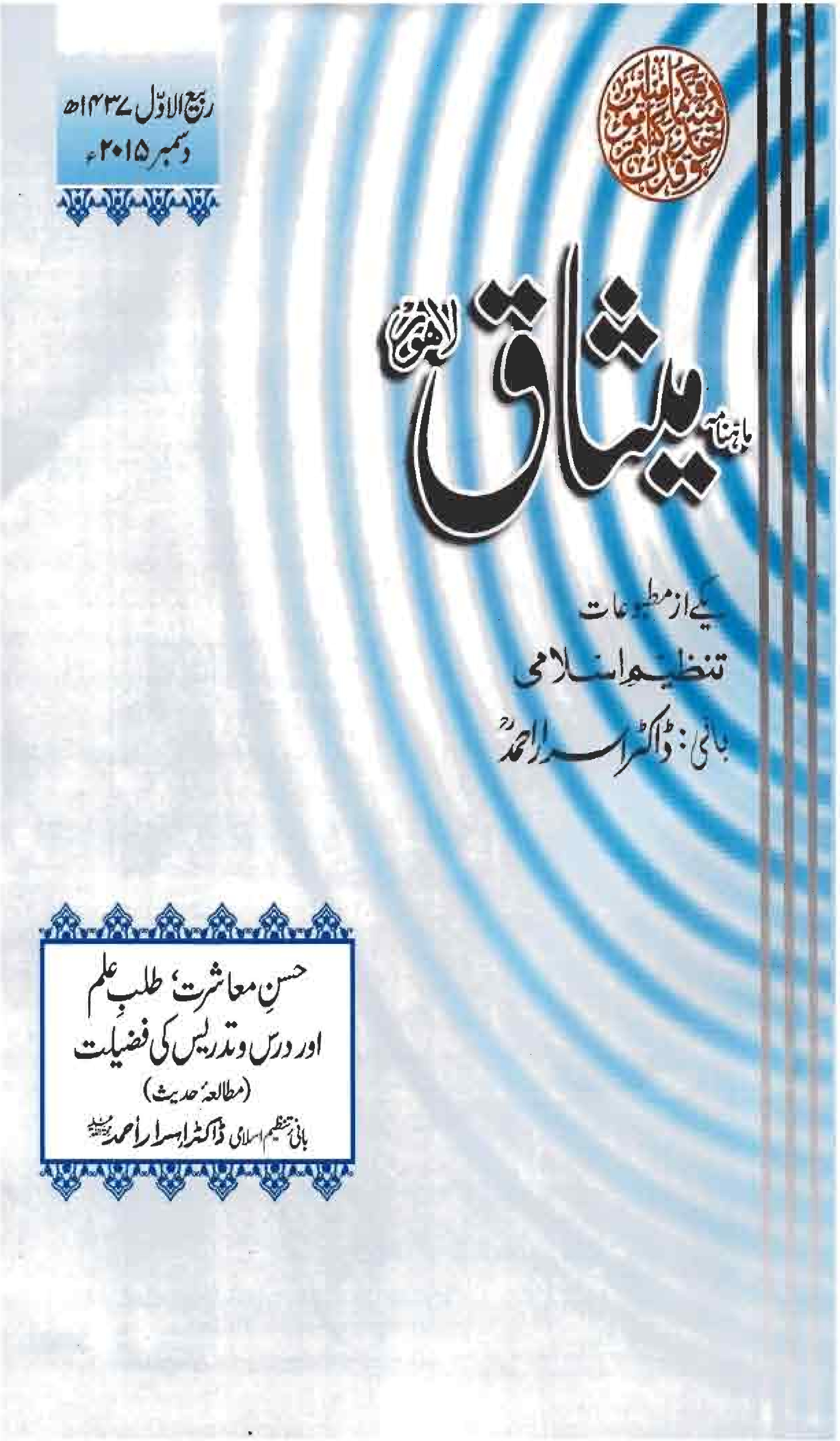

ربیع الاوّل ۱۴۳۷ھ
دسمبر ۲۰۱۵ء
ماہنامہ
میثاق
لاہور
یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
حسنِ معاشرت، طلبِ علم
اور درس و تدریس کی فضیلت
(مطالعۂ حدیث)
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

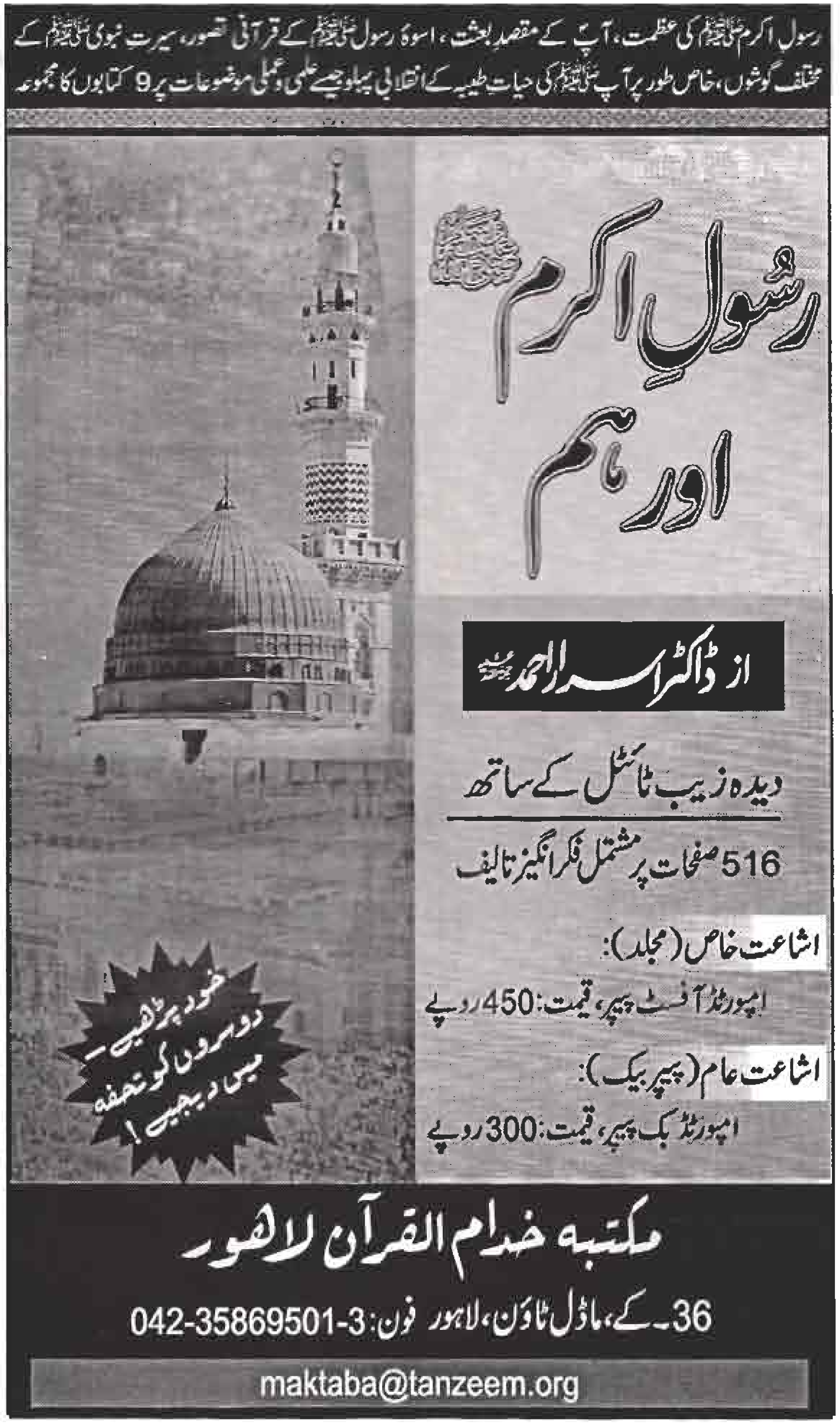

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے
مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ
رسولِ اکرم ﷺ
اور ہم
از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ
516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف
اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے
اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے
خود پڑھیے۔ دوسروں کو تحفہ بھی دیجیے!
مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501
maktaba@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 64
شمارہ : 12
ربیع الاوّل 1437ھ
دسمبر 2015ء
فی شمارہ -/30

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5
جمہوریت، لبرل ازم اور قوم کا مستقبل — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القرآن 9
سورۃ المؤمنون (آیات ۱ تا ۵۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعۂ حدیث 31
حسنِ معاشرت، طلبِ علم
اور درس و تدریس کی فضیلت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعلیم و تعلّم 51
ابراہیمی نصابِ تعلیم و تربیت:
نبویؐ فہم و فراست کا شاہکار — محمد رشید عمر

تذکّر و تدبّر 57
قرآن کریم کی اصولی باتیں (۴) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

اُسوۂ حسنہ 65
رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جامعیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دعوت فکر 73
حافظ، قرآن کیوں بھول جاتے ہیں؟ — ڈاکٹر حافظ ظفر احمد

خطوط و نکات 77
''بیان القرآن'' کی تکمیل پر ہدیۂ تبریک — تنویر

یاد رفتگاں 79
حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

حسن معاشرت 88
عورت کا الگ رہائش کا مطالبہ:
چند ضروری وضاحتیں — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

❁❁❁

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

جمہوریت‘ لبرل ازم اور قوم کا مستقبل

’’قوم کا مستقبل جمہوریت اور لبرل ازم سے وابستہ ہے‘‘۔ یہ جملہ اگر کسی مقرر نے جوشِ خطابت میں کہہ دیا ہوتا یا کسی آزاد خیال کالم نگار نے دانشوری بگھاری ہوتی تو اسے نہ اہمیت دینے کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی قسم کی تشویش کا اظہار لازم تھا۔ پاکستان کی بنیاد پر بے دردی سے کلہاڑا چلانے والا یہ جملہ پاکستان کے وزیراعظم نے کہا ہے جو ملک کے چیف ایگزیکٹو ہیں‘ بیس کروڑ پاکستانیوں کے نمائندہ ہونے کے دعوے دار ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہیں جو اسلامی جمہوری اتحاد (IJI) کی سیڑھی لگا کر ایوانِ اقتدار میں داخل ہوئے‘ اور جن کی فیملی کا لنک مذہب اسلام سے بہت گہرا پایا جانا عوام اور خواص میں بہت مشہور ہے۔ ملک میں اندرونی اور بیرونی حوالہ سے جیسے کیسے بھی حالات ہوں یہ صاحب رمضان کا آخری عشرہ حرمین شریفین میں ہی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے سابقہ دوادوار میں علی الاعلان اور جلاوطنی کے دوران حرم شریف اور مسجد نبوی میں ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے کا ذکر کر چکے ہیں‘ اگرچہ اس حوالہ سے عملاً ایک قدم بھی نہیں اٹھایا گیا بلکہ مجبوریوں کا اظہار کیا جاتا رہا۔ تاہم ایک توقع بندھی ہوئی تھی۔ بہرحال اس جملہ سے اپنے سابقہ نظریات سے اعلانِ براءت سمجھ میں آتا ہے۔ اس پس منظر میں سوچنے کا مقام یہ ہے کہ وہ لبرل ازم کا مطلب نہیں جانتے یا انہوں نے اپنا قبلہ تبدیل کر لیا ہے؟ یہ محض ٹرن نہیں ہے بلکہ یوٹرن ہے۔ ۲۰۱۳ء کی انتخابی مہم میں انہوں نے خود کو اور اپنی جماعت مسلم لیگ (ن) کو اسلامی جماعتوں سے کسی قدر دور رکھا اور وزیراعظم بننے کے بعد بھی سیکولر عناصر سے اپنے تعلقات مضبوط کیے‘ صرف مولانا فضل الرحمٰن کو اس مرتبہ اپنے قریب کیا‘ لیکن اس کی وجہ مشترکہ عمران مخالفت تھی۔ نہ نواز شریف کو مولانا کے اسلام سے کوئی غرض ہے اور نہ مولانا کو اپنے حلیف کا اسلام سے تائب ہونا ناگوار گزرا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ مولانا‘ نواز شریف کے لبرل ازم کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں۔

جمہوریت اور لبرل ازم کا اس قوم کے مستقبل ہی نہیں ماضی اور حال سے بھی کیا تعلق ہے اور پاکستان کس حد تک ان سے وابستہ ہے‘ اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک

جمہوریت کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانانِ برصغیر کی قیامِ پاکستان کے حق میں رائے دہی کامیابی کا ایک نہایت اہم عنصر تھا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کا مسلمانوں کی نشستیں جیت لینے سے قیامِ پاکستان کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں اور اسلام اور پاکستان دشمن ہندو جماعت کانگریس کے پاس تقسیم ہند کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹوں کے انبار کیوں لگائے؟ کیا کوئی بدبخت بھی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ انہیں یعنی مسلمانانِ برصغیر کو ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!‘‘ بتایا گیا تھا اور اس پر لبیک کہتے ہوئے انہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ یقیناً مسلمان ہندو کے رویے سے تنگ تھے‘ یہ ایک فیکٹر تھا‘ لیکن یہ فیکٹر تو ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں بھی موجود تھا‘ تب مسلم لیگ کیوں مسلمان نشستوں پر بھی بری طرح ہار گئی؟ اس لیے کہ اس وقت تقسیم ہند کی بات واضح طور پر چل نہیں رہی تھی یا کم از کم عوامی سطح پر اس حوالہ سے کوئی آگاہی نہ تھی۔ اس وقت تک مسلم لیگ نے جماعتی سطح پر واضح طور پر پاکستان کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ تقسیم ہند کی بنیاد مذہب تھی۔ مسلم لیگ کی قیادت کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے کانگریس کو دوقومی نظریہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اسی نے تقسیم کی بنیاد رکھی‘ لیکن اس کے لیے مسلمانوں کو ہندوستان بھر میں زبردست تحریک چلانا پڑی تھی۔ یہ تحریک نہ چلتی تو اولاً رائے دہی کی نوبت ہی نہ آتی اور ثانیاً نتائج شاید ۱۹۳۷ء سے مختلف نہ ہوتے۔ البتہ اس وقت یعنی تحریکِ پاکستان کے دوران کوئی لبرل ازم کا نام لیتا تو پاگل اور مجنوں قرار دیا جاتا یا تحریکِ پاکستان کا مخالف اور دشمن گردانا جاتا۔

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ پاکستان دنیا کی واحد نظریاتی ریاست ہے۔ پاکستان کے آئین میں یہ درج ہے کہ اسلام ریاست کا مذہب ہے۔ قرارداد مقاصد اب آئین کا باقاعدہ حصہ ہے۔ پاکستان میں کوئی قانون سازی قرآن وسنت کے خلاف نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی ایک آئینی تقاضا ہے۔ ماضی میں ہمارے مختلف حکمران یہ اقرار کر چکے ہیں کہ اتنی مدت میں تمام قوانین کو اسلام کے مطابق بنا دیا جائے گا۔ آئین کی بہت سی دفعات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جن کا نفاذِ اسلام سے تعلق ہے۔ آئین میں اسلام کے حوالہ سے حکومتی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ہم صرف آئین کی شق نمبر ۳۱ کا متن درج کر رہے ہیں تاکہ قارئین اس تناظر میں وزیراعظم کے بیان کا جائزہ لیں اور یہ فیصلہ کریں کہ آیا نواز شریف جس آئین کے تحت حلف اٹھا کر وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں اس بیان سے اس کی کھلم کھلا خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی ہے اور کیا ان

پر آئین کی خلاف ورزی پر آئین کے آرٹیکل نمبر ۶ کا اطلاق نہیں ہوتا؟ آئین کی دفعہ ۳۱ کا متن کچھ یوں ہے:

(۱) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لیے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اقدام کیے جائیں گے جن کی مدد سے وہ قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مطلب ذہن نشین کر سکیں۔

(۲) پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں مملکت مندرجہ ذیل امور کے لیے کوشش کرے گی:

(ا) قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینا‘ عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کے لیے سہولت بہم پہنچانا اور قرآن پاک کی صحیح اور من وعن طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرنا۔

(ب) اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیار اور ترقی کی پابندی کو فروغ دینا‘ اور

(ج) زکوٰۃ (عشر) اوقاف اور مساجد کی باقاعدہ تنظیم کا اہتمام کرنا۔

لبرل ازم اور سیکولرازم میں الفاظ کے فرق کے علاوہ کوئی فرق نہیں‘ جس میں بنیادی بات یہ ہے کہ مذہب کا ریاست سے کوئی سروکار نہیں ہوگا‘ ریاست کی نظر میں سب مذاہب ایک جیسے ہیں اور کسی مذہب کا ریاستی امور میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بھارت جس کا نعرہ سیکولرازم تھا وہاں کے وزیر اعظم نریندر مودی بھارت کو ہندو بھارت بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور ہندو تاریخ کے مطابق وہاں اقلیتی مذاہب کے پیروکار کبھی بھی آرام وسکون سے نہ رہے۔ وزیر اعظم کو اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ آخر کیوں پاکستان اس حالت کو پہنچا ہے کہ معاشی حوالہ سے ہم دیوالیہ ہوا چاہتے ہیں۔ سیاسی لحاظ سے عدم استحکام کا معاملہ ہے۔ ہماری زمینیں زرخیز ہیں۔ گیس‘ تیل‘ کوئلہ‘ تانبا‘ چاندی‘ سونا جیسی دولت ہماری زمین کے بطن میں کثیر تعداد میں پوشیدہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بوڑھوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے‘ جوان نایاب ہوتے جا رہے ہیں‘ جبکہ پاکستان میں جوانوں کی بہت بڑی فوج ہے۔ عسکری لحاظ سے باوجود اس کے کہ ہم ایٹمی قوت ہیں اور باوجود اس کے کہ ہم دفاعی لحاظ سے کافی حد خود کفیل ہو چکے ہیں اور ظاہری طور پر مستحکم نظر آتے ہیں‘ ہمارے حکمرانوں کی غیروں کے سامنے ٹانگیں کانپتی رہتی ہیں۔ کبھی ہم یہ سن کر ان کے سامنے ڈھیر ہو جاتے ہیں: Either you are with us or against us اور جابر وظالم کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے

خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں‘ پھر ’’Do more!‘‘ کا نغمہ مسلسل ہمارے کانوں میں رس گھولتا رہتا ہے۔ اور پھر ہم ایک اسلامی ریاست کو تباہ و برباد کرنے میں دشمنانِ اسلام کا بازو بن جاتے ہیں۔ آخر کیوں ایسا ہے‘ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے! محترم وزیر اعظم! اس کی صرف اور صرف وجہ یہ ہے کہ اسلام کو ہم نے پہلے ہی کتابوں میں بند کر کے رکھا ہوا ہے‘ عملی طور پر آپ کا پسندیدہ لبرل ازم تو پہلے ہی اس ملک کی جڑوں میں براجمان ہے۔ محترم وزیر اعظم! ہم نے یہ خطہ زمین حاصل کیا تھا جس کی خاطر برصغیر کے مسلمانوں نے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کی تھی‘ اس کی بنیادوں میں لاکھوں انسانوں کا خون بطور بھرتی ڈالا گیا۔ ہزاروں ایسی خواتین کی عصمتیں لٹ گئیں کہ آسمان بھی کبھی ان کی جھلک نہ دیکھ پایا تھا‘ لیکن بدقسمتی سے مغربی دنیا کے دباؤ میں آ کر ہم نے ایسی بنیادیں رکھنے والے زمین کے ٹکڑے پر کبھی سوشلزم‘ کبھی سیکولرازم کے میٹریل سے عمارت بنانا شروع کر دی۔ ظاہر ہے یہ بے بنیاد عمارت کسی طوفان کا مقابلہ کیا کرتی‘ یہ بادِ سحر کے جھونکوں سے بھی لرز اٹھتی ہے۔ ہم اس کی سلامتی کے حوالہ سے ہر وقت خطرات محسوس کرتے رہتے ہیں۔ دنیا بھی ہمیں تاریخیں دیتی رہتی ہے کہ فلاں فلاں وقت تک پاکستان کے نام سے کوئی ملک دنیا کے نقشہ پر نہ ہوگا۔

یہاں یہ سوال یقیناً اٹھے گا کہ اگر بالفعل پاکستان میں سیکولرازم یا لبرل ازم ہی لاگو ہے تو وزیر اعظم کے محض لبرل ازم کہہ دینے سے کیا فرق واقع ہو جائے گا‘ بلکہ یہ تو اعترافِ حقیقت ہے۔ ہماری رائے میں ایسا نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنے کی ضرورت ہے جیسے کوئی بے عمل مسلمان (non-practicing Muslim) ہو‘ ارکانِ اسلام کی پابندی نہ کرتا ہو‘ نماز سے غفلت برتتا ہو‘ کبھی موڈ ہوا تو پڑھ لی‘ روزہ رکھ بھی لیا اور چھوڑ بھی دیا‘ وغیرہ وغیرہ۔ یہ مسلمان گناہگار ہے‘ اسے توبہ نہ کرنے کی صورت میں اپنے گناہوں کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ دوسرا شخص مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود ارکانِ اسلام کی فرضیت کا ہی انکاری ہے اور بے باکی سے اس کا واضح اعلان کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ یہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ غافل نمازی کسی وقت دوبارہ رجوع کر سکتا ہے‘ اس لیے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے‘ وہ ایک کام کو صحیح سمجھ کر اپنی غفلت اور سستی کی وجہ سے ترک کرتا ہے۔ دوسرا آدمی سرے سے انکاری ہے‘ اس شخص کا رجوع کرنے کا امکان انتہائی کم ہے۔ آج اگر پاکستان میں اسلامی نظام نہیں تو حکمران اس حوالے سے تاویل گھڑتے تھے‘ عذر تراشتے تھے‘ جھوٹی سہی لیکن عوام کو اسلام کی لوری دیتے تھے۔

(باقی صفحہ 30 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ المُؤمِنُون

سورۃ المؤمنون مکی سورتوں کے اس سلسلے کی آخری سورت ہے جو سورۂ یونس سے شروع ہوا تھا۔ اس سلسلے یا گروپ میں چودہ مکی سورتیں ہیں اور حجم کے اعتبار سے پورے قرآن میں مکی سورتوں کا یہ سب سے بڑا گلدستہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱ تا ۱۱

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ
عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ
لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ
مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ ﴿۷﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ
لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹﴾
اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾

اس سورت کی ابتدائی گیارہ آیات مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے تیسرے حصے میں شامل ہیں۔ اس حصے کے دروس میں اعمالِ صالحہ کی تفصیلات ایک خاص تدریج سے زیرِ بحث آئی ہیں۔ اس تدریج میں سب سے پہلی ترجیح تو فرد اور اس کے اعمال کی ہے۔ یعنی ایک بندۂ مؤمن کے اعمال انفرادی حیثیت سے صالح اور نیک ہوں اور اس کے سیرت و کردار کی تعمیر بہتر بنیادوں پر استوار ہو۔ چنانچہ اس تیسرے حصے کا پہلا درس سورۃ المؤمنون کی پہلی گیارہ آیات پر مشتمل ہے۔ ان گیارہ آیات میں بندۂ مؤمن کی سیرت کی اساسات بیان کی گئی

ہیں۔ یہ بنیادیں ٹھوس اور پختہ ہوں گی تو سیرت کی عمارت بھی مضبوط ہو گی۔ چنانچہ اس تیسرے حصے میں قرآن حکیم کے مختلف مقامات کے دروس کی مدد سے اعمال صالحہ کے مباحث کو تدریجاً آگے بڑھایا گیا ہے کہ مضبوط اور نیک سیرت کے حامل افراد سے جب خاندان وجود میں آئے گا تو ان کی عائلی زندگی کا نقشہ کیسا ہو گا۔ نیک اور صالح افراد پر مشتمل معاشرے کے خدوخال کیسے ہوں گے اور پھر معاشرے کی بلند ترین سطح پر یعنی ریاستی معاملات میں ان افراد کے سیرت و کردار کی کرامات کا ظہور کن کن صورتوں میں ہو گا۔

آیت ۱ ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾﴾ ''کام نکال لے گئے اہلِ ایمان۔''

اس آیت کا یہ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ؒ کا ہے۔ مگر خود حضرت شیخ الہندؒ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ''موضح القرآن'' میں شاہ عبدالقادر دہلوی ؒ کا ترجمہ ہی اختیار کیا ہے اور اس میں کہیں کہیں زبان کی تبدیلیوں کے علاوہ کوئی اور تبدیلی نہیں کی۔ گویا بنیادی طور پر یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ہے اور میرے نزدیک لفظ فلح کی اصل روح کے قریب ترین ہے۔ ''فلاح'' کا ترجمہ بالعموم ''کامیابی'' سے کیا جاتا ہے، لیکن اس کے مفہوم کو درست انداز میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظ ''فلاح'' کے حقیقی اور لغوی معنی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ اس مادہ کے لغوی معنی ہیں: ''پھاڑنا''۔ اسی معنی میں کسان کو عربی میں ''فلّاح'' کہا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے ہل کی نوک سے زمین کو پھاڑتا ہے۔ عربی کی ایک کہاوت ہے: اِنَّ الحَدِیدَ بِالحَدِیدِ یُفلَحُ یعنی لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس طرح فَلَح کا مفہوم گویا فَلَق کے قریب تر ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۵ میں لفظ ''فلق'' اسی مفہوم میں آیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی ؕ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ گٹھلیوں اور بیجوں کو پھاڑنے والا ہے''۔ اس سے اگلی آیت میں یہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے نمودِ صبح کے حوالے سے اس طرح استعمال ہوا ہے: ﴿فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ﴾ یعنی وہ تاریکی کا پردہ چاک کر کے صبح کو نمودار کرنے والا ہے۔ چونکہ فلح اور فلق دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں اور دونوں کے معنی پھاڑنا ہے اس لیے آیت زیر نظر میں فلح کا مفہوم سمجھنے کے لیے ﴿فٰلِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی﴾ کے حوالے سے گٹھلی کے پھٹنے اور اس کے اندر سے کونپلیں برآمد ہونے کے عمل کو ذہن میں رکھیں۔ جس طرح گٹھلی کے اندر پورا پودا بالقوّہ (potentially) موجود ہے، اسی طرح انسان کے اندر بھی اس کی انا یا روح اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اور جس طرح گٹھلی کے پھٹنے (فلق) سے دو کونپلیں برآمد ہوتی

ہیں اور پھر ان سے پورا درخت بنتا ہے اسی طرح جب انسانی وجود کے اندر موجود مادیت کے پردے چاک (فلح) ہوتے ہیں تو اس کی انا یا روح بے نقاب ہوتی ہے اور اس کی نشوونما سے اس کی معنوی شخصیت ترقی پاتی ہے۔ انسان کی اسی انا یا روح کو اقبال نے خودی کا نام دیا ہے اور اس کو اُجاگر (develop) کرنے کے تصور پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے خصوصی طور پر آئیڈیل یا آدرش کے فلسفہ کے حوالے سے (اس ضمن میں گزشتہ صفحات میں سورۃ الحج کی آیت ۷۳ کی تشریح بھی مدنظر رہے) اپنی معرکۃ الآراء کتاب The Idealogy of the Future میں اقبال کے فلسفہ خودی کی بہترین تعبیر کی ہے۔

انسان بظاہر ایک مادی وجود کا نام ہے۔ اس وجود میں ہڈیاں ہیں، گوشت ہے اور دیگر اعضاء ہیں۔ لیکن اس مادی وجود کے اندر اس کی انا اور روح بھی ہے جو اس کی اصل شخصیت ہے۔ انسان کہتا ہے میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میری آنکھ، میری ٹانگ، میرا سر، میرا جسم! لیکن اس ''میرا'' اور ''میری'' کی تکرار میں ''میں'' کہاں ہے اور کون ہے؟ یہ ''میں'' دراصل انسان کی انا یا روح ہے۔ یعنی انسان کو حیوانوں کے مقابلے میں صرف عقل و شعور کی دولت سے ہی نہیں نوازا گیا بلکہ اسے روحِ ربانی کی نورانیت بھی عطا کی گئی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

دم چیست؟ پیام است! شنیدی نشنیدی؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است ندیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!!

انسانی جسم کے اندر اس کی روح مادی غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ گویا یہ ایک مخفی خزانہ ہے جسے کھود کر نکالنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس خزانے کو کام میں لانا ہے تو ''فلّاحی'' کے عمل سے مادیت کے پردوں کو چاک کرنا ہوگا اور آیت زیر نظر میں قَدْ اَفْلَحَ کے الفاظ اسی مفہوم میں آئے ہیں کہ مؤمنین صادقین نے اپنی روحوں پر پڑے ہوئے مادیت کے پردوں کو چاک کر کے اصل خزانے یعنی روح کو بے نقاب کرنے اور اس کی نشوونما (develop) کرنے کا مشکل کام کر دکھایا ہے۔ جبکہ عام انسان کی تمام تر توجہ اپنے حیوانی وجود پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ نہ وہ اپنی روح کی خبر لیتا ہے اور نہ ہی اس کی غذا اور نشوونما کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے انسان کی روح سسک سسک کر مرجاتی ہے اور اس کا جسم اس کی روح کا مقبرہ بن

جاتا ہے۔ بظاہر ایسے شخص کا شمار زندہ انسانوں میں ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ مردہ ہوتا ہے۔ مثلاً ابوجہل زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ تھا۔ وہ اندھا اور بہرا تھا، اسی لیے نہ تو وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو پہچان سکا اور نہ آپؐ کی دعوت کو سن سکا۔ اس کے برعکس ایک بندۂ مؤمن ہے جو حقیقت میں زندہ ہے، اس لیے کہ اس کی روح زندہ ہے۔ جیسے کہ سورۃ النحل کی آیت ۹۷ میں ارشاد ہوا: ﴿فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ ''تو ہم ضرور اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی''۔ چنانچہ جو شخص بھی اپنی خودی کے ارتقاء (development of self) اور اپنے کردار کی تعمیر (development of character) کا مشکل کارنامہ سرانجام دے پائے گا وہی حقیقت میں کامیاب قرار پائے گا اور وہی آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے قَدْ اَفْلَحَ کا مصداق ٹھہرے گا۔ اور یہ کامیابی ہر انسان کی پہنچ میں ہے، کیونکہ روح کی دولت تو ہر انسان کو عطا ہوئی ہے۔ ہندی شاعر بھیک کے بقول: ع ''بھیکا بھوکا کوئی نہیں، سب کی گدڑی لال!'' یعنی بھوکا یا نادار کوئی بھی نہیں ہے، ہر انسان کی گٹھڑی میں لعل موجود ہے، بس اس گٹھڑی کی گرہ کھول کر اس ''لعل'' یا دولت کو دریافت کرنے اور اسے کام میں لانے کا فن اسے آنا چاہیے۔ یہی نکتہ اس خوبصورت فارسی شعر میں ایک دوسرے انداز میں پیش کیا گیا ہے: ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو وسمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

یعنی تمہارے اندر بھی ایک مہکتا ہوا چمن موجود ہے، تم اپنے دل کے دروازے سے داخل ہو کر اس چمن کی سیر سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔

اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں اس طرح واضح کیا گیا ہے: ﴿وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) یعنی خود تمہارے اندر معرفت کا سامان موجود ہے مگر تم لوگ اس سے غافل ہو۔ اپنشد کے ایک جملے کا انگریزی ترجمہ اس طرح ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths which encompass his real self."

یعنی انسان اپنی جہالت کے باعث ان مادی غلافوں ہی کو اپنی ذات سمجھ بیٹھتا ہے جو اس کی ذات (انا یا روح) کے گرداگرد لپٹے ہوئے ہیں۔ اور یوں وہ نہ خود کو پہچان پاتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت اسے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کی معرفت ضروری ہے، جیسے کہ صوفیاء کا قول ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو اپنی ''انا'' (self) سے غافل رہا وہ معرفتِ الٰہی سے بھی محروم رہا۔ یہی نکتہ ہے جو سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ﴾ ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا''۔ چنانچہ لفظ فلح کا یہ مفہوم ذہن میں رکھ کر اس آیت کو پڑھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی شخصیت اور ذات کے مادی غلافوں کو پھاڑ کر اپنی معنوی شخصیت اور روح کو اُجاگر کرنے اور اس کے ذریعے سے عرفانِ ذات اور پھر معرفتِ الٰہی تک پہنچنے جیسے مشکل مراحل' اہل ایمان کامیابی سے طے کر لیتے ہیں۔ اور وہ کون سے اہلِ ایمان ہیں:

آیت ۲ ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝۲﴾ ''وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔''

کامیاب' بامراد اور فائز المرام اہلِ ایمان وہ ہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے ان کی توجہ رکعتوں کی گنتی پوری کرنے پر ہی مرکوز نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی نمازوں میں عاجزی اور فروتنی اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں حقیقی خشوع وخضوع کا منظر پیش کرتی ہیں۔

آیت ۳ ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝۳﴾ ''اور جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔''

یعنی ان کا دوسرا وصف ہے بے کار باتوں سے احتراز کرنا' بچنا' دامن بچائے رکھنا۔ لغو سے مراد گناہ یا معصیت کا کام نہیں' بلکہ ہر ایسا عمل یا کام ہے جو بے فائدہ اور فضول ہو۔ جیسے لوگ محفل جما کر تاش کھیلتے ہیں اور وقت کو ایسے ضائع کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بوجھ (liability) ہو اور اسے سر سے اتار پھینکنا ناگزیر ہو۔ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ یہ وقت ہی تو انسان کا سب سے بڑا سرمایہ (asset) ہے۔ اس وقت سے فائدہ اٹھا کر ہی انسان اپنی عاقبت کو سنوار سکتا ہے اور جو اس وقت کو فضول میں ضائع کرتا ہے وہ گویا اپنی عاقبت کو ضائع کرتا ہے۔ اس آیت میں مؤمنینِ صادقین کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ مہلتِ زندگی کو اپنا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ایک ایک لمحے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ صرف ایک دفعہ ''سبحان اللہ'' کہنے سے اللہ کے ہاں ان کے درجات کس قدر بلند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا وقت فضول اور بے مقصد مصروفیات میں ضائع نہیں کرتے۔ وہ زندگی کے

ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے اپنی شخصیت کی تعمیر اور آخرت کے اجر وثواب کے حصول کے لیے صرف کرتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝۴﴾ ''اور وہ جو ہر دم اپنے تزکیے کی طرف متوجہ رہنے والے ہیں۔''

یہ کامیاب وبامراد اہل ایمان کا تیسرا وصف بیان ہوا۔ یہاں ''زکوٰۃ'' کا لفظ اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ اپنے لغوی معنی میں آیا ہے اور اس سے مراد تزکیۂ نفس ہے۔ اس لیے کہ یہ ابتدائی مکی دور کی سورت ہے اور اُس وقت تک زکوٰۃ ادا کرنے کا ابھی کوئی تصور نہیں تھا۔ ویسے بھی قرآن حکیم میں زکوٰۃ کے ساتھ عموماً لفظ ''ایتاء'' آتا ہے۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے مؤمن بندے ہمہ وقت' ہمہ تن اپنے نفس کے تزکیے کے لیے کوشاں اور اپنے دامن کے داغ دھبے دھونے کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔

آیت ۵ ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝۵﴾ ''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

آیت ۶ ﴿إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝۶﴾ ''سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں کے' تو ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔''

ان کا چوتھا وصف یہ بیان ہوا کہ وہ صرف جائز طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتے ہیں اور اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یعنی جنسی جذبہ فی نفسہٖ بُرا نہیں' بلکہ برائی اس کے غلط استعمال میں ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں تجرد کی زندگی بسر کرنا اور اپنے جنسی جذبہ کو' جو فطرت اور جبلّت میں ایک نہایت قوی جذبہ ہے' کچلنا ایک اعلیٰ ترین روحانی قدر قرار دیا جاتا ہے' جبکہ اسلام دینِ فطرت ہے' چنانچہ وہ اس فطری وجبلی جذبہ کو بالکلیہ کچلنے اور دبانے کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منشا ومدعا یہ ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے جائز اور حلال راہیں اختیار کی جائیں۔ نکاح کو اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنتوں میں سے ایک سنّت قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہاں جنسی تسکین کے جائز راستوں کے لیے ''غَيْرُ مَلُومِينَ'' کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

آیت ۷ ﴿فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝۷﴾ ''تو جو کوئی بھی اس کے علاوہ کچھ چاہے گا تو ایسے لوگ ہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اس سلسلے میں جو کوئی حلال اور جائز طریقے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا وہ

گناہ اور زیادتی کا مرتکب قرار پائے گا۔

آیت ۸ ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۝۸﴾ ’’اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

اس آیت میں دو وصف بیان ہوئے ہیں۔ یعنی پانچواں وصف امانتوں کی پاسداری اور چھٹا وصف ایفائے عہد۔

آیت ۹ ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۝۹﴾ ’’اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری محافظت کرتے ہیں۔‘‘

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اس مضمون کا آغاز بھی نماز کے ذکر سے کیا گیا تھا اور اس کا اختتام بھی نماز کے ذکر پر کیا جا رہا ہے۔ آیت ۲ میں کامیاب و بامراد مؤمنین کی پہلی صفت یہ بتائی گئی تھی: ﴿الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝۲﴾ کہ وہ لوگ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔ یعنی اس مضمون کے آغاز میں نماز کی باطنی کیفیت کے حسن کا ذکر کیا گیا تھا‘ جبکہ اختتام پر آیت زیرِ نظر میں نماز کے نظام کی بات کی گئی ہے کہ سچے اہلِ ایمان نماز پر مداومت کرتے ہیں اور اس کے تمام آداب و قوانین کو کما حقہٗ ملحوظ رکھتے ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۝۱۰﴾ ’’یہی لوگ ہیں جو وارث ہوں گے۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۱۱﴾ ’’وہ وارث ہوں گے ٹھنڈی چھاؤں والے باغات کے‘ اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ !!

آیات ۱۲ تا ۲۲

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ
مَّكِیۡنٍ ۪﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ
عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ٭ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ
الۡخٰلِقِیۡنَ ؕ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ لَمَیِّتُوۡنَ ؕ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ تُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۶﴾
وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعَ طَرَآئِقَ ٭ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الۡخَلۡقِ غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنۡزَلۡنَا

مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسۡكَنّٰهُ فِی الۡاَرۡضِ ٭ۖ وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ
لَقٰدِرُوۡنَ ۚ﴿۱۸﴾ فَاَنۡشَاۡنَا لَكُمۡ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ ۘ لَكُمۡ فِیۡهَا فَوَاكِهُ
كَثِیۡرَةٌ وَّمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَیۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ
وَصِبۡغٍ لِّلۡاٰكِلِیۡنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِیۡكُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهَا
وَلَكُمۡ فِیۡهَا مَنَافِعُ كَثِیۡرَةٌ وَّمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ۙ﴿۲۱﴾ وَعَلَیۡهَا وَعَلَی الۡفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۲۲﴾

اب جو مضمون آ رہا ہے وہ اس سے پہلے سورۃ الحج کی آیت ۵ میں بھی آ چکا ہے‘ مگر وہاں اختصار کے ساتھ آیا تھا‘ جبکہ یہاں زیادہ وضاحت اور جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ اس سے سورۃ الحج کے ساتھ اس سورت کی مشابہت کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ۝۱۲﴾ ’’ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔‘‘

تلوار کو نیام سے باہر کھینچنے کے عمل کو ’’سَلَّ یَسُلُّ‘‘ جبکہ نیام سے باہر نکلی ہوئی ننگی تلوار کو ’’مَسۡلُوۡل‘‘ کہا جاتا ہے۔ کسی بھی چیز کا اصل جوہر جو اس میں سے کشید کیا گیا ہو ’’سُلَالَة‘‘ کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو براہِ راست مٹی کے جوہر سے تخلیق کیا گیا اور پھر پوری نسل انسانی چونکہ ان کی اولاد تھی اس لیے اپنی تخلیق کے حوالے سے ہر انسان کو گویا اسی مادہ تخلیق یعنی مٹی سے نسبت ٹھہری۔ لیکن میرے نزدیک اس کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ مرد کے جسم میں بننے والا نطفہ دراصل مٹی سے کشید کیا ہوا جوہر ہے۔ اس لیے کہ انسان کو خوراک تو مٹی ہی سے حاصل ہوتی ہے‘ چاہے وہ معدنیات اور نباتات کی شکل میں اسے براہِ راست زمین سے ملے یا نباتات پر پلنے والے جانوروں سے حاصل ہو۔ اس خوراک کی صورت میں گارے اور مٹی کے جوہر کشید ہو کر انسانی جسم میں جاتے ہیں اور اس سے وہ نطفہ بنتا ہے جس سے بالآخر بچے کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ ۝۱۳﴾ ’’پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔‘‘

رحم (uterus) کو ایک محفوظ ٹھکانہ قرار دیا گیا ہے‘ جس کی دیوار بہت مضبوط ہوتی ہے۔ نطفہ رحمِ مادر میں پہنچتا ہے اور بیضۂ انثی کے ساتھ مل کر fertilized ovum رحم کی دیوار کے اندر embed ہو جاتا ہے‘ گویا دفن ہو جاتا ہے جیسے بیج زمین کے اندر دفن

ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ’’پھر ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل دے دی‘‘

عَلَقَه کا ترجمہ عام طور پر ’’جما ہوا خون‘‘ ہوتا آیا ہے جو کہ غلط ہے۔ لغوی اعتبار سے عربی مادہ علق (ع ل ق) سے معلق، تعلق، متعلق، علاقہ وغیرہ الفاظ تو مشتق ہیں لیکن اس لفظ کا جمے ہوئے خون کے مفہوم و معانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ دراصل جس زمانے میں یہ تراجم ہوئے ہیں اس میں نہ تو dissection کا کوئی تصور تھا اور نہ ہی ابھی مائیکروسکوپ ایجاد ہوئی تھی، لہٰذا علم الجنین کے بارے میں تمام تر معلومات کی بنیاد ظاہری مشاہدے پر تھی۔ اور چونکہ ابتدائی ایام کا حمل گرنے کی صورت میں رحم سے بظاہر خون کے لوتھڑے ہی برآمد ہوتے تھے، اس لیے اس سے یہی سمجھا گیا کہ رحمِ مادر میں انسانی تخلیق کی ابتدائی شکل جمے ہوئے خون کے لوتھڑے کی سی ہوتی ہے۔ آج جب ہم جنینیات (Embryology) کے بارے میں جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں لفظ ’’عَلَقَه‘‘ پر غور کرتے ہیں تو اس کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ جدید سائنسی معلومات کے مطابق fertilized ovum ابتدائی مرحلے میں رحم کی دیوار کے اندر جما ہوا (embeded) ہوتا ہے، جبکہ اگلے مرحلے میں وہ اس سے اُبھر کر bulge out کر کے دیوار کے ساتھ جونک کی طرح لٹکنے لگ جاتا ہے۔ اور یہی دراصل ’’علقه‘‘ ہے۔

﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ ’’پھر علقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا‘‘

پھر اگلے مرحلے میں یہ ’’علقه‘‘ گوشت کے ایک نیم چبائے ہوئے لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر کیتھ ایل مور (موصوف دورِ حاضر میں علم الجنین پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا ذکر بیان القرآن کے حصہ اوّل، تعارفِ قرآن کے باب پنجم میں بھی آچکا ہے) کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کی وضاحت کے لیے کچے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا اور واقعتاً اسے دانتوں سے چبا کر دکھایا کہ دانتوں کے نشان پڑ جانے سے اس گوشت کے ٹکڑے کی جو شکل بنی ہے بعینہٖ وہی شکل اس مرحلے میں ’’مُضغة‘‘ کی ہوتی ہے۔

﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ ’’پس ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا‘‘

اور اس کے بعد ’’ثُمّ‘‘ کے ساتھ چوتھے اور آخری دور کا ذکر ہے:

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ ’’پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پر اٹھا دیا۔‘‘

آیت کے اس حصے میں معنی کا ایک جہان آباد ہے، مگر اسے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ عام لوگ قرآن کی ایسی بہت سی آیات کو پڑھتے ہوئے بے خبری سے یوں آگے گزر جاتے ہیں جیسے ان میں کوئی خاص بات نہ ہو، مگر جس پر حقیقت منکشف ہوتی ہے اسے کلام اللہ کے ایک ایک حرف کے اندر قیامت مضمر دکھائی دیتی ہے۔ کتنے ہی مفسرین ہیں جو سورۃ الحدید کی تیسری آیت ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کی تفسیر کیے بغیر آگے گزر گئے ہیں، لیکن امام رازیؒ جب اسے پڑھتے ہیں تو ان کی نظر کسی اور ہی جہان کا نظارہ کرتی ہے، اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِيْقٌ مُهِيْبٌ (جان لو کہ یہ مقام بہت مشکل، بہت گہرا اور بہت پُرہیبت ہے!) یہ قرآن کا معجزاتی پہلو ہے اور اس کا تعلق دیکھنے والی آنکھ سے ہے۔ بہرحال اِن آیات کو پھر سے پڑھیے اور تخلیق کے مراحل میں ’’فَ‘‘ اور ’’ثُمَّ‘‘ کے نازک فرق کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ غور کیجیے! یہاں ’’ثُمَّ‘‘ کا وقفہ ایک پورے دور کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ تخلیقی عمل کے اندرونی مراحل کے بیان کو ’’فَ‘‘ سے الگ کیا گیا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾﴾ یعنی مٹی کے جوہر سے نطفے کی تخلیق ایک مکمل دور ہے۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿١٣﴾﴾ یہ دوسرا دور ہے۔ یعنی نطفے کا قرارِ مکین میں پہنچ کر ایک بیج کی حیثیت سے دفن ہو جانا۔ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ یہ تیسرے دور کا ذکر ہے اور اس دور کے اندر تین مراحل ہیں، ہر مرحلے کے ذکر کے ساتھ ’’فَ‘‘ کا استعمال ہوا ہے: ﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾۔ اس کے بعد ’’ثُمَّ‘‘ کے ساتھ چوتھے اور آخری دور کا ذکر ہے: ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ ’’پھر ہم نے اسے ایک اور دوسری مخلوق بنا کھڑا کیا‘‘۔ یعنی اب یہ ایک بالکل نئی مخلوق ہے۔ یہاں ’’بالکل نئی مخلوق‘‘ سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفصیل اس حدیث میں ملتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بایں الفاظ نقل ہوئی ہے:

((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ......))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب خلق آدم وذریته۔ وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفية خلق الآدمی فی بطن امه ......

''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں‘ اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں‘ اور اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے‘ پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے......''

یعنی چالیس دن تک نطفہ‘ پھر چالیس دن تک علقہ اور اس کے بعد چالیس دن تک مُضغۃ‘ ایک سو بیس دن (چار ماہ) میں یہ تین مراحل مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں۔ وہ کولڈ سٹوریج (عالمِ ارواح) سے اس کی روح کو لا کر اس مادی جسم کے ساتھ ملا دیتا ہے اور یوں ایک نئی مخلوق وجود میں آ جاتی ہے۔ یعنی اب تک وہ ایک حیوانی جسم تھا‘ لیکن اس روح کے پھونکے جانے کے بعد وہ انسان بن گیا۔ البتہ اس حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں بھی لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ ایک سو بیس دن کے بعد اس جسم میں جان ڈال دی جاتی ہے۔ یعنی روح کو ’جان‘ (life) سمجھا گیا ہے۔ گویا چار ماہ تک تخلیقی مراحل سے گزرتا ہوا یہ وجود بے جان تھا؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی یا جان اس میں پہلے دن سے ہی موجود تھی۔ حتیٰ کہ باپ کے نطفے کا خلیہ (spermatozoon) اور ماں کا بیضہ (ovum) بھی اپنی اپنی جگہ پر زندہ وجود ہیں اور ان دونوں کے اختلاط سے وجود میں آنے والا جفتہ (zygote) بھی۔ بہر حال ایک سو بیس دن کے بعد اس جسدِ حیوانی میں ''روح'' پھونکی جاتی ہے‘ جو ایک نورانی چیز ہے اور وہی اسے حیوان سے انسان بناتی ہے۔ اور اسی تبدیلی یا تخلیقی مرحلے کو آیت زیر نظر میں ''خَلْقًا اٰخَرَ'' (ایک نئی تخلیق) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ⑭﴾ ''پس بڑا با برکت ہے اللہ‘ تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔''

آیت ۱۵ ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ⑮﴾ ''پھر اس کے بعد تم لوگ یقیناً مرنے والے ہو۔''

آیت ۱۶ ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ⑯﴾ ''پھر قیامت کے دن تم لوگ یقیناً اٹھا دیے جاؤ گے۔''

یہ گویا حیاتِ انسانی کے مختلف مراحل کا بہترین اور جامع ترین بیان ہے‘ جو ان آیات میں ہوا ہے۔ اس موضوع پر یہ قرآن حکیم کا ذروۂ سنام (climax) ہے۔

آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ﴾ ''اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں''

عام طور پر ''سَبْعَ طَرَآئِقَ'' سے سات آسمان مراد لیے جاتے ہیں۔ ''طرائق'' کے معنی راستوں کے بھی ہیں اور طبقوں کے بھی۔ دوسرے معنی کے مطابق اس سے ''تہہ بر تہہ سات آسمان'' مراد ہیں۔ واللہ اعلم! جب تک انسانی علم کی رسائی اس کی حقیقت تک نہ ہو جائے‘ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لحاظ سے یہ آیت متشابہات میں سے ہوگی۔

﴿وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ⑰﴾ ''اور ہم اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔''

آیت ۱۸ ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ﴾ ''اور ہم نے آسمان سے پانی اُتارا ایک اندازے کے مطابق''

زمین پر پانی اسی مقدار میں رکھا گیا ہے جس قدر واقعتاً یہاں اس کی ضرورت ہے۔ اگر اس مقدار سے پانی زیادہ ہو جائے تو روئے زمین سیلاب میں ڈوب جائے اور پوری نوعِ انسانی اس میں غرق ہو جائے۔ اور اگر اس مقدار سے کم ہو تو زمین پر زندگی کا وجود ہی ممکن نہ رہے۔

﴿فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ⑱﴾ ''تو اسے ہم نے زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کو واپس لے جانے پر بھی قادر ہیں۔''

اگر ہم چاہیں تو روئے ارضی سے پانی کا وجود ختم کر دیں اور یوں دنیا میں زندگی کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔

آیت ۱۹ ﴿فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ﴾ ''تو ہم نے اس سے پیدا کیے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات''

﴿لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ⑲﴾ ''ان میں تمہارے لیے بہت سے پھل ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔''

ان میں سے اکثر پھل تمہارے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ﴾ ''اور وہ درخت بھی (ہم نے پیدا کیا) جو سینا پہاڑ سے نکلتا ہے''

اس سے زیتون کا درخت مراد ہے جو عام طور پر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑی علاقوں میں

بکثرت پایا جاتا ہے۔

﴿تَنۡۢبُتُ بِالدُّہۡنِ وَ صِبۡغٍ لِّلۡاٰکِلِیۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''وہ تیل بھی لے کر اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔''

ایک زمانے میں روئے زمین پر وسیع علاقے کی آبادی کا اپنی خوراک کے لیے بنیادی طور پر اسی زیتون پر ہی انحصار تھا اور عام لوگ روغن زیتون میں روٹی کو بھگو کر کھا لیتے تھے۔

آیت ۲۱ ﴿وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ﴾ ''اور یقیناً تمہارے لیے ان چوپایوں میں بھی عبرت کا سامان ہے''

اگر تم سمجھنا چاہو تو ان میں تمہاری ہدایت کے لیے بہت واضح نشانیاں ہیں۔

﴿نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہَا﴾ ''ہم پلاتے ہیں تمہیں اس میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہے''

سورۃ النحل میں اس عجوبۂ قدرت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ﴿وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''اور یقیناً تمہارے لیے چوپایوں میں بھی عبرت ہے' ہم پلاتے ہیں تمہیں اُس میں سے جو اُن کے پیٹوں میں ہوتا ہے' گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ' پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار''۔ اگر ہم گائے یا بھینس کا پیٹ چاک کر کے دیکھیں تو اس کے اندر ہمیں گوبر اور خون ہی نظر آئے گا۔ یہ اللہ کی قدرت ہے کہ انہی آلائشوں کے اندر سے صاف شفّاف دودھ پیدا ہوتا ہے جو انسانوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور قدرت پر غور کریں تو بچوں کی نظم کے یہ اشعار بے اختیار زبان پر آ جاتے ہیں: ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی
اُس خالق کو کیوں نہ پکاریں جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں

﴿وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ کَثِیۡرَۃٌ وَّ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور تمہارے لیے ان میں بہت سے فوائد ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔''

یہ چوپائے بہت سے کاموں میں تمہاری مدد کرتے ہیں۔ تمہارے ساز و سامان کی نقل و حمل میں تمہارے کام آتے ہیں اور تم اپنی غذا میں پروٹین بھی انہی کے گوشت سے حاصل

کرتے ہو۔

آیت ۲۲ ﴿وَ عَلَیۡہَا وَ عَلَی الۡفُلۡکِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور ان (چوپایوں) پر اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔''

چنانچہ ان سب چیزوں اور نعمتوں میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

آیات ۲۳ تا ۵۰

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ
غَیۡرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ مَا ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثۡلُکُمۡ ۙ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتَفَضَّلَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِکَۃً ۚۖ مَّا سَمِعۡنَا
بِہٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿ۚ۲۴﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِہٖ جِنَّۃٌ فَتَرَبَّصُوۡا بِہٖ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۲۵﴾
قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ بِمَا کَذَّبُوۡنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا
وَ وَحۡیِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ فَاسۡلُکۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ
وَ اَہۡلَکَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ مِنۡہُمۡ ۚ وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ
اِنَّہُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسۡتَوَیۡتَ اَنۡتَ وَ مَنۡ مَّعَکَ عَلَی الۡفُلۡکِ فَقُلِ الۡحَمۡدُ
لِلّٰہِ الَّذِیۡ نَجّٰنَا مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۸﴾ وَ قُلۡ رَّبِّ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا
وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا
مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿ۚ۳۱﴾ فَاَرۡسَلۡنَا فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا
لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا
وَ کَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ وَ اَتۡرَفۡنٰہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۙ مَا ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۙ
یَاۡکُلُ مِمَّا تَاۡکُلُوۡنَ مِنۡہُ وَ یَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَکُمۡ
اِنَّکُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اَیَعِدُکُمۡ اَنَّکُمۡ اِذَا مِتُّمۡ وَ کُنۡتُمۡ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّکُمۡ
مُّخۡرَجُوۡنَ ﴿۳۵﴾ ہَیۡہَاتَ ہَیۡہَاتَ لِمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اِنۡ ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ
وَ نَحۡیَا وَ مَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا رَجُلُ ۣافۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا وَّ مَا
نَحۡنُ لَہٗ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ بِمَا کَذَّبُوۡنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِیۡلٍ

لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝٤٠ۚ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤١ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝٤٢ؕ مَا تَسْبِقُ مِنْ
اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝٤٣ؕ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً
رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ ۝٤٤ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝٤٥ۙ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝٤٦ۚ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ
مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝٤٧ۚ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝٤٨ وَلَقَدْ
اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝٤٩ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً
وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝٥٠ؑ

آیت ۲۳ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ ’’اور ہم نے بھیجا نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف‘ تو اُس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو‘ تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے اُس کے سوا۔‘‘

﴿ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝٢٣﴾ ’’تو کیا تم (اُس کے غضب سے) ڈرتے نہیں ہو؟‘‘

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ﴾ ’’تو کہا اُسؑ کی قوم کے اُن سرداروں نے جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی‘ یہ کچھ بھی نہیں مگر تمہاری طرح کا ایک بشر‘‘

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بڑے بڑے سرداروں نے اپنے عوام کو تسلی دینے کے لیے ان کے سامنے یہ دلیل اختیار کی کہ یہ نوحؑ بھی تمہاری طرح کا ایک انسان ہی تو ہے اور ایک انسان اللہ کا فرستادہ کیسے ہوسکتا ہے؟

﴿يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ﴾ ’’یہ تمہارے اوپر اپنی فوقیت چاہتا ہے۔‘‘

اس نے اقتدار و اختیار اور سرداری حاصل کرنے کے لیے نبوت و رسالت کا یہ ڈھونگ رچایا ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ﴾ ’’اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو بھیج دیتا‘‘

اگر اللہ نے اپنا رسول بھیجنا ہوتا تو وہ اپنے فرشتوں میں سے کسی کو بھیجتا۔ اس شخص میں کون سی ایسی خاص بات تھی کہ اللہ نے اسے اس کام کے لیے منتخب کیا ہے؟

﴿مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝٢٤﴾ ’’ہم نے اس طرح کوئی بات اپنے پہلے آباء و اَجداد میں نہیں سنی!‘‘

اس کا یہ دعویٰ بالکل نیا ہے۔ ہم نے ایسی کوئی بات اپنے باپ دادا سے تو نہیں سنی کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے بھی کسی کو رسول مبعوث کرتا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝٢٥﴾ ’’یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جس کو کچھ جنون لاحق ہوگیا ہے‘ چنانچہ تم لوگ انتظار کرو اس (کے انجام) کا کچھ وقت کے لیے۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝٢٦﴾ ’’نوحؑ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! تو میری مدد فرما اس پر کہ انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا﴾ ’’تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری نگرانی اور وحی کی ہدایات کے مطابق ایک کشتی بناؤ‘‘

﴿فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ﴾ ’’پھر جب ہمارا حکم آن پہنچے اور تنور اُبل پڑے‘‘

﴿فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ﴾ ’’تو اس میں رکھ لینا تمام مخلوق میں سے جوڑے‘‘

ہر قسم کے جاندار‘ حیوانات وغیرہ میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ کو بھی اس کشتی میں سوار کر لینا تاکہ ان کی نسل محفوظ رہ سکے۔

﴿وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ﴾ ’’اور اپنے گھر والوں کو بھی (سوار کرالینا) سوائے ان کے جن کے بارے میں ان میں سے پہلے ہی بات طے ہوچکی ہے۔‘‘

اس استثناء میں آپؑ کی بیوی اور ایک بیٹا شامل تھے‘ جن کے بارے میں پہلے ہی ہلاکت کا فیصلہ ہوچکا تھا۔

﴿وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝٢٧﴾ ’’اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا جنہوں نے شرک کیا‘ یقیناً وہ سب غرق کر دیے

جائیں گے۔"

آیت ۲۸ ﴿فَاِذَا اسۡتَوَیۡتَ اَنۡتَ وَ مَنۡ مَّعَکَ عَلَی الۡفُلۡکِ فَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ نَجّٰنَا مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۸﴾﴾ "پھر جب تم اور تمہارے سب ساتھی کشتی میں بیٹھ جائیں تو کہنا کہ کُل شکر اُس اللہ کا ہے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔"

آیت ۲۹ ﴿وَ قُلۡ رَّبِّ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا﴾ "اور دعا کرنا کہ اے میرے پروردگار! مجھے اتاریو برکت والا اتارنا"

پروردگار! ہم تیری مہربانی اور تیرے حکم سے اس کشتی میں سوار ہوئے ہیں۔ ہمیں مستقبل کا کچھ علم نہیں۔ ہم نہیں جانتے اب یہ کشتی ہمیں لے کر کہاں کہاں جائے گی اور کہاں پر جا کر رکے گی۔ یہ معاملہ اب تیرے سپرد ہے۔ ہماری التجا ہے کہ اس کشتی سے ہمارے اترنے کو بھی بابرکت بنادے۔

﴿وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ "اور یقیناً تو ہی ہے بہترین اتارنے والا۔"

آیت ۳۰ ﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ "یقیناً اس میں بڑی نشانیاں ہیں اور یقیناً ہم آزمانے والے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت دنیا میں مختلف لوگوں کو مختلف انداز میں آزماتے رہتے ہیں۔ اس اصول اور قانون کے بارے میں سورۃ الملک کے آغاز میں یوں ارشاد ہوا ہے: ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت ۲) "وہی (اللہ) ہے جس نے موت اور حیات کو بنایا ہی اس لیے ہے کہ تمہیں پرکھے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے بہتر کون ہے!"

آیت ۳۱ ﴿ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ "پھر اُن کے بعد ہم نے ایک اور نسل کو اٹھایا۔"

اس سے مراد قومِ عاد یا قومِ ثمود ہے۔

آیت ۳۲ ﴿فَاَرۡسَلۡنَا فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ﴾ "پس ان میں بھی ہم نے ایک رسولؑ بھیجا انہی میں سے"

یہاں پر نام نہیں بتایا گیا لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ حضرت ہود علیہ السلام کا تذکرہ ہے یا

پھر حضرت صالح علیہ السلام کا۔

﴿اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾ "(اُسؑ نے بھی یہی کہا) کہ بندگی کرو اللہ کی اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟"

آیت ۳۳ ﴿وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ﴾ "اور کہا اُسؑ کی قوم کے اُن سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کا انکار کیا تھا"

﴿وَ اَتۡرَفۡنٰہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۙ﴾ "اور جنہیں ہم نے آسودگی عطا کی تھی دنیا کی زندگی میں"

قومِ نوحؑ کے سرداروں کی طرح اس قوم کے بڑے سرداروں نے بھی اپنے عوام کو اسی منطق سے مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ:

﴿مَا ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۙ یَاۡکُلُ مِمَّا تَاۡکُلُوۡنَ مِنۡہُ وَ یَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ "یہ کچھ بھی نہیں مگر تمہاری طرح کا ایک بشر، وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔"

آیت ۳۴ ﴿وَ لَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَکُمۡ ۙ اِنَّکُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ "اور اگر تم لوگ اپنے ہی جیسے ایک انسان کی اطاعت کرو گے تب تو تم بڑا نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔"

ذرا ان سرداروں کی منطق اور دلیل ملاحظہ ہو۔ یعنی اگر تم لوگ ہماری اطاعت کرو تو درست اور بجا، لیکن اس شخص کا کہنا مانو تو ناقابل قبول! اس لیے کہ ہم پیدائشی سردار ہیں، تمہارے حکمران ہیں، ہمارا حکم تو تمہیں ماننا ہی ماننا ہے۔ ہماری اطاعت تو تم پر لازم ہے ہی، مگر اس شخص کی اطاعت اس لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ تمہاری طرح کا انسان ہے۔ یہ دلیل دیتے ہوئے وہ بھول گئے کہ وہ خود کوئی فرشتے نہیں بلکہ اپنے عوام جیسے ہی انسان ہیں اور انسان ہوتے ہوئے ہی وہ اپنے جیسے انسانوں سے اطاعت اور فرمانبرداری کی توقع رکھتے ہیں۔

آیت ۳۵ ﴿اَیَعِدُکُمۡ اَنَّکُمۡ اِذَا مِتُّمۡ وَ کُنۡتُمۡ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّکُمۡ مُّخۡرَجُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ "کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تم (پھر سے) نکال لیے جاؤ گے؟"

آیت ۳۶ ﴿ہَیۡہَاتَ ہَیۡہَاتَ لِمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ "ناممکن! بالکل ناممکن ہے یہ بات،

جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے!''

آیت ۳۷ ﴿اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''یہ کچھ نہیں ہے مگر بس ہماری دنیا کی زندگی (ہی اصل زندگی) ہے‘ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ رہتے ہیں‘ اور ہم (دوبارہ) اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

آیت ۳۸ ﴿اِنۡ هُوَ اِلَّا رَجُلُ نِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا﴾ ''یہ نہیں ہے مگر ایک ایسا شخص جس نے جھوٹ باندھا ہے اللہ پر‘‘

اس نے اپنی نبوت و رسالت کے بارے میں جھوٹ گھڑ کر اللہ سے منسوب کر دیا ہے۔

﴿وَّمَا نَحۡنُ لَهٗ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور ہم اس کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔''

آیت ۳۹ ﴿قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ بِمَا کَذَّبُوۡنِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اُس (رسولؑ) نے کہا: پروردگار! تو میری مدد فرما اس تکذیب کے مقابلے میں جو انہوں نے میری کی ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿قَالَ عَمَّا قَلِیۡلٍ لَّیُصۡبِحُنَّ نٰدِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''اللہ نے فرمایا کہ کچھ ہی دیر میں یہ لازماً ہو جائیں گے پچھتانے والے۔''

آیت ۴۱ ﴿فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّیۡحَةُ بِالۡحَقِّ فَجَعَلۡنٰهُمۡ غُثَآءً ۚ﴾ ''اور ان کو آ پکڑا ایک چنگھاڑ نے حق کے ساتھ‘ تو ہم نے بنا دیا انہیں کوڑا کرکٹ۔''

جیسے کھیت سے فصل کٹ جانے کے بعد پیچھے بھوسہ اور خس و خاشاک پڑے رہ جاتے ہیں اسی طرح انہیں جھاڑ جھنکاڑ اور کوڑے کرکٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔

﴿فَبُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''تو پھٹکار ہے اُن ظالموں کی قوم پر۔''

آیت ۴۲ ﴿ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قُرُوۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''پھر اُن کے بعد ہم نے اور بہت سی قومیں پیدا کیں۔''

آیت ۴۳ ﴿مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''کوئی قوم بھی نہ اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکی اور نہ ہی اسے مؤخر کر سکی۔''

آیت ۴۴ ﴿ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ﴾ ''پھر بھیجا ہم نے اپنے رسولوں کو پے در پے۔''

﴿کُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوۡلُهَا کَذَّبُوۡهُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا﴾ ''جب بھی کسی قوم

کے پاس آیا اُس کا رسول تو انہوں نے اسے جھٹلایا‘ تو ہم نے بھی ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا‘‘

ان کی تکذیب کے جواب میں ہم بھی ان قوموں کو یکے بعد دیگرے ہلاک کرتے چلے گئے۔

﴿وَّجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِیۡثَ ۚ﴾ ''اور ہم نے بنا دیا ان کو قصے کہانیاں۔''

ان قوموں کے نام اب دنیا میں کہانیوں اور داستانوں کی حد تک باقی رہ گئے ہیں کہ قومِ مدین فلاں علاقے میں بستی تھی‘ عامورہ اور سدوم کے شہر فلاں جگہ پر واقع تھے‘ وغیرہ وغیرہ۔

﴿فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''تو پھٹکار ہے اُس قوم پر کہ جو ایمان نہیں لاتی۔''

آیت ۴۵ ﴿ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۬ۙ بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۵﴾﴾ ''پھر ہم نے بھیجا موسیٰؑ اور اُس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور روشن سند کے ساتھ۔''

آیت ۴۶ ﴿اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَکَانُوۡا قَوۡمًا عَالِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف‘ تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ بڑے سرکش لوگ تھے۔''

آیت ۴۷ ﴿فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں جبکہ ان کی قوم ہماری محکوم ہے!''

فرعون اور اُس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام پر ایک اعتراض تو وہی کیا جو حضرت نوح‘ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کی قومیں اپنے رسولوں کے بارے میں کر چکی تھیں۔ یعنی یہ کہ وہ ہماری طرح کے انسان ہیں۔ لیکن یہاں ایک دوسرا مسئلہ بھی تھا اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا تعلق فرعون کی محکوم قوم سے تھا۔ بنی اسرائیل مصر میں فرعون کے غلام تھے اور وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی غلام قوم کے دو اشخاص اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے دو بدو بات کریں۔

سیاق و سباق کے حوالے سے یہاں پر لفظ ''عبادت'' کے اصل مفہوم کو بھی سمجھ لیں۔ ظاہر ہے کہ اس لفظ کا جو مفہوم آج ہمارے ذہنوں میں ہے بنی اسرائیل اس مفہوم میں فرعون یا اس کی قوم کی عبادت نہیں کرتے تھے‘ یعنی وہ ان کی پرستش یا پوجا نہیں کرتے تھے‘ بلکہ وہ ان کی اطاعت کرتے تھے اور یہاں فرعون نے اسی اطاعت کو لفظ ''عبادت'' سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرعون کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی قوم ہماری غلام ہے‘ ہماری اطاعت شعار ہے‘ ہم ان پر مطلق اختیار رکھتے ہیں‘ ہم جو چاہیں انہیں حکم دیں اور جیسا قانون ہم چاہیں ان پر لاگو کریں۔ ہم

چاہیں توان کے لڑکوں کو قتل کرواتے رہیں اور چاہیں توان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیا کریں۔ یہ لوگ ہمارے غلام اور محکوم ہونے کے باعث ہمارے کسی حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتے۔

آیت ۴۸ ﴿فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''توانہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا اور ہو گئے ہلاک ہونے والوں میں سے۔''

آیت ۴۹ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تا کہ وہ ہدایت پائیں۔''

آیت ۵۰ ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً﴾ ''اور ہم نے ابنِ مریم (عیسیٰؑ) اور اُس کی والدہ (مریم) کو ایک نشانی بنا دیا''

﴿وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾﴾ ''اور ہم نے ان دونوں کو ایک اونچے ٹیلے پر پناہ دی جو پُرسکون اور چشموں والی جگہ تھی۔''

یہاں جس جگہ کا ذکر ہوا ہے اس کے مقام اور زمانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے مراد وہی ٹیلا ہے جہاں ایک کھجور کے سایے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔ شاید آپؑ کی ولادت کے بعد ماں بیٹا کچھ عرصہ اسی جگہ پر قیام پذیر رہے ہوں۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کی رائے میں یہ کسی اور جگہ کا ذکر ہے۔ اس دوسری رائے کی بنیاد جن معلومات پر ہے ان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت اس علاقے میں ہیرودیس بادشاہ کی حکومت تھی جو یہودی تھا۔ جس طرح برصغیر میں انگریزوں کی طرف سے راجوں اور نوابوں کو ان کے علاقوں میں حکمران بنا دیا جاتا تھا اسی طرح رومن شہنشاہ نے اس علاقے میں اس شخص کو بادشاہ مقرر کر رکھا تھا۔ اس کٹھ پتلی بادشاہ کو ایک خواب آیا تھا جس کی بنا پر نجومیوں نے اس کے دل میں یہ وہم ڈال دیا کہ تمہاری سلطنت میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو بڑا ہو کر تمہاری ہلاکت کا باعث بنے گا۔ چنانچہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کی سلطنت میں جو لڑکا بھی پیدا ہو‘ اسے قتل کر دیا جائے۔ اِن حالات میں حضرت مریمؑ حضرت عیسیٰؑ کو لے کر مصر چلی گئیں اور اس یہودی بادشاہ کے انتقال کے بعد اس وقت واپس آئیں جب حضرت عیسیٰؑ دس بارہ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر بائبل میں بھی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس روایت کو درست سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اپنی اس جلاوطنی کے دوران مصر میں جس جگہ پر انہوں نے قیام کیا تھا آیت زیرِ نظر میں اس جگہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۞ ۞ ۞

بقیہ: عرضِ احوال

اسلامی جماعتیں بھی یہ صدا بلند کرتی رہی تھیں کہ اسلام کے حوالے سے اپنا وعدہ پورا کیا جائے‘ لیکن اگر آپ صاف صاف یہ کہہ دیتے ہیں کہ قوم کا مستقبل جمہوریت اور لبرل ازم سے وابستہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظری سطح پر بھی اسلام کو الوداع کہا جا رہا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک نظریاتی ملک میں حکمران کو لبرل ازم کی بات کہنے کی اس لیے جرأت ہوئی کہ نفاذِ دین کے حوالہ سے اسلامی جماعتوں نے بھی اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی۔ وہ بھی اسمبلیوں کی نشستوں کو بڑی لالچ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی خاطر خالص سیکولر جماعتوں سے اتحاد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دوسروں کے سہارے اسمبلیوں میں پہنچ بھی جائیں تو نفاذ شریعت کے لیے آواز بلند کرنے کی بجائے وزارتیں حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ عوام مہنگائی اور دوسرے دنیوی مسائل میں اس بری طرح الجھ چکے ہیں یا منصوبہ کے تحت انہیں الجھایا جا چکا ہے کہ وہ دوسری بات سوچنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔ پھر یہ کہ حصولِ دنیا کا لالچ حکمرانوں سے لے کر گلی محلوں کے عام پاکستانیوں تک سرایت کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمران نے لبرل ازم کا تذکرہ کر کے جو بالواسطہ اسلام کو الوداع کہا ہے‘ اس سے کسی کے منہ کا ذائقہ خراب نہیں ہوا۔ صرف اسلامی جماعتوں سے تعلق رکھنے والی بعض شخصیات دھیمی آواز میں لبرل ازم کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں۔ وزیر اعظم صاحب! ہم سب نے مل جل کر اسلام سے اپنے تعلقات کو کشیدہ کیا ہوا ہے‘ انہیں بھرپور کوشش سے استوار اور مستحکم کرنے کی کوشش کیجیے۔ اسی میں ہماری دنیا اور آخرت سنور سکتی ہے۔ ریاست کے بنیادی نظریہ سے باقاعدہ علیحدگی اور لاتعلقی کا اعلان نہ کریں‘ یہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے یہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔

۞ ۞ ۞

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حسنِ معاشرت‘ طلبِ علم اور درس و تدریس کی فضیلت

بانئ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۱۱ جولائی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ (الحجرات)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ ‘ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ :

((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ کُرْبَۃً مِّنْ کُرَبِ الدُّنْیَا نَفَّسَ اللّٰہُ عَنْہُ کُرْبَۃً مِّنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ، وَمَنْ یَّسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ، یَسَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، وَاللّٰہُ فِیْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ ـــــ وَمَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَلْتَمِسُ فِیْہِ عِلْمًا سَہَّلَ اللّٰہُ لَہٗ بِہٖ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّۃِ ، وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ ، یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ ، وَیَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ ، اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ ، وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ ، وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ ، وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ

عِنْدَہٗ ـــــ وَمَنْ بَطَّأَ بِہٖ عَمَلُہٗ لَمْ یُسْرِعْ بِہٖ نَسَبُہٗ)) (۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

’’جو شخص کسی مؤمن کی دُنیوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف رفع کرے گا‘ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف رفع فرمائے گا۔ اور جو شخص کسی تنگدست پر آسانی کرے گا‘ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانی فرمائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا‘ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے ـــــ اور جو شخص طلبِ علم کی خاطر کسی راستہ پر چلے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا۔ جب کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کتاب اللہ کی تلاوت اور تعلیم کے لیے جمع ہوتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے‘ اللہ تعالیٰ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں‘ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر اپنے پاس موجود مخلوق میں کرتا ہے ـــــ اور جسے اس کا عمل ہی پیچھے چھوڑ دے تو اس کا نسب اسے آگے نہیں لے جا سکتا۔‘‘

معزز سامعین کرام!

گزشتہ جمعہ‘ ہم نے اربعین نووی کی ۳۵ ویں حدیث کا مطالعہ کیا تھا اور آج ہم ۳۶ ویں حدیث کا مطالعہ کریں گے۔ یہ دونوں حدیثیں ایک جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں اسلامی معاشرت کے بنیادی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث ۳۵ میں اس کا منفی پہلو پیش کیا گیا ہے اور اسی کا مثبت پہلو حدیث ۳۶ میں بیان ہو رہا ہے۔ مسلمانوں میں آپس میں محبت‘ مواخات‘ ہمدردی‘ نصرت اور حمایت کا جو تعلق ہونا چاہیے‘ اس کے ضمن میں پچھلی حدیث میں بعض کاموں سے روکا گیا تھا‘ کیونکہ وہ چیزیں اخوتِ باہمی کے منافی ہیں اور دلوں میں فاصلے اور ایک دوسرے کے خلاف کدورت پیدا

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار‘ باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن......

کرنے والی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ......)) یہ سب نہی کے صیغے ہیں کہ یہ نہ کرو‘ یہ نہ کرو۔

سورۃ الحجرات میں بیان کردہ حسنِ معاشرت کے اصول

اسی کا نقشہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۱ اور ۱۲ میں کھینچا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۰ پچھلی مرتبہ میں نے تلاوت کی تھی‘ جس میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ’’مؤمن سب آپس میں بھائی بھائی ہیں‘‘ اور بھائی بندی کا بنیادی اور اولین تقاضا یہ ہے کہ اگر تمہارے دو بھائیوں میں اختلاف ہو جائے ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ ’’تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح اور اصلاح کرا دیا کرو‘‘ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ’’اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘‘۔ ایسے موقع پر غیر جانبداری کی روش صحیح نہیں ہے کہ میں کیا کروں‘ اپنا معاملہ ہے خود سے حل کریں۔ اگر میں ایک کی بات کروں گا تو دوسرا ناراض ہو جائے گا اور دوسرے کو حق پر قرار دوں گا تو پہلا ناراض ہو جائے گا‘ لہٰذا میں اس مسئلہ میں پڑتا ہی نہیں ہوں۔ ہرگز نہیں‘ یہ بہت غلط رویہ ہے۔ اہلِ ایمان کا فرض ہے کہ مسلمان بھائیوں میں اگر کوئی اختلاف ہو گیا ہے‘ کوئی چپقلش ہو گئی ہے تو اسے رفع کریں اور مصالحت کرائیں‘ صلح کرائیں۔

تمسخر اڑانے کی ممانعت: اس کے بعد آیت ۱۱ اور ۱۲ میں ’’لائے نہی‘‘ کے ساتھ چھ احکام آئے ہیں۔ پہلی بات یہ فرمائی گئی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! تم میں سے کچھ مرد دوسرے مردوں کا تمسخر نہ کیا کریں‘ ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے) اُن (مذاق اڑانے والوں) سے (اللہ کی نگاہ میں) بہتر ہوں‘‘۔ آپ نے کسی کو اس کے جسمانی عیب پر مذاق کا نشانہ بنایا‘ لیکن کیا پتا اس کے دل میں آپ سے کہیں زیادہ ایمان ہو اور وہ اللہ کی نگاہ میں آپ سے زیادہ محبوب ہو‘ لہٰذا کسی کا مذاق نہ اڑایا کرو۔ چونکہ یہ مرض خواتین میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا خصوصی طور پر عورتوں کو مخاطب کر کے اس سے منع کیا

گیا: ﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾ ’’اور نہ کچھ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں‘ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (اللہ کے نزدیک)‘‘۔ قرآن حکیم میں عام طور پر مذکر کے صیغے میں ایک بات آتی ہے اور وہ مَردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہوتی ہے‘ لیکن جہاں خاص عورتوں کا معاملہ ہو تو وہاں بات کو دہرا کر لایا جاتا ہے۔ ایک دوسرے پر فقرے چست کرنے اور مذاق اڑانے کی عادت چونکہ عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے اس لیے یہاں خاص طور پر عورتوں کا ذکر الگ سے بھی کیا گیا ہے۔

عیب چینی اور برے نام رکھنے کی ممانعت: دوسری بات یہ فرمائی گئی: ﴿وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ﴾ ’’اور ایک دوسرے کو عیب نہ لگایا کرو‘‘۔ یعنی بہتان تراشی اور عیب چینی نہ کیا کرو۔ تیسری بات یہ فرمائی: ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ’’اور ایک دوسرے کے چڑانے والے نام نہ رکھ لیا کرو‘‘۔ یہ ایک مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے کہ آپ کسی فرد کسی فرد یا کسی گروہ کے اصل نام کو چھوڑ کر اس کے لیے کوئی ایسا نام رکھ لیں جو اسے پسند نہ ہو۔ فرض کیجیے کہ جو لوگ اہلحدیث یا سلفی کہلواتے ہیں آپ نے ان کو وہابی کہہ دیا تو یہ چیز ان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ ’’ایمان کے بعد تو یہ برے نام بھی برے ہیں‘‘۔ عمل تو دور کی بات ہے‘ یہ جو تم زبانی کلامی بات کر دیتے ہو اس کی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی شدید گرفت ہوگی۔ ہم وہ حدیث پڑھ چکے ہیں جس میں حضور ﷺ نے حضرت معاذ ؓ سے کہا تھا: ((ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ' اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ)) ’’اے معاذ! تجھے تیری ماں گم پائے‘ لوگوں کو ان کے چہروں (یا نتھنوں) کے بل جہنم میں ان کی زبانوں کی کھیتیاں ہی تو لے جائیں گی‘‘۔ زبان بے لگام ہوتی ہے اور زبان سے کوئی لفظ نکالنے میں کوئی طاقت نہیں لگتی‘ کچھ خرچ نہیں آتا‘ جو چاہا‘ جب چاہا بک دیا‘ لیکن ہر ہر لفظ جو انسان کے منہ سے نکلتا ہے وہ یا تو جنت میں جا کے پودا بن جائے گا یا جہنم کا کوئی جھاڑ جھنکاڑ بنے گا‘ جو اسے آخرت میں جا کے کاٹنا پڑے گا۔ لہٰذا لوگوں کی عیب چینی اور ان

کے برے نام رکھنے سے باز رہنا چاہیے۔

سوئے ظن کی ممانعت: آیت ۱۲ میں چوتھی بات کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے اہل ایمان! زیادہ بدگمانی سے بچو' اس لیے کہ بعض گمان (اللہ کی نگاہ میں) گناہ بن جاتے ہیں''۔ بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے کسی کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ اگر تو کوئی واقعہ ہو گیا ہے' کوئی ثبوت ہے' تب تو ٹھیک ہے کہ آپ کوئی رائے قائم کریں۔ ایسے ہی بغیر کسی ثبوت اور واقعے کے آپ نے سوئے ظن قائم کر لیا تو یہ بہت بڑا گناہ بن جاتا ہے۔

عیب تلاش کرنے کی ممانعت: پانچویں بات یہ فرمائی: ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو''۔ کہا جاتا ہے کہ مکھی گندگی پر ہی بیٹھے گی' اس لیے کہ وہ اس کی فطرت ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ کھوج کرید میں رہتے ہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' وہاں کوئی دنگا فساد ہے یا نہیں؟ ذرا سی کوئی بات اگر مل گئی تو لے اڑے۔ یہ ان کا ذوق ہوتا ہے۔ تو اس سے روکا گیا ہے' بلکہ آج کی زیر مطالعہ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر تمہارے کسی مسلمان بھائی کا کوئی عیب تمہارے علم میں خود بخود آ جائے تو اسے بیان کرنا تو دور کی بات ہے' اس کے اوپر پردہ ڈالو۔ اس کے برعکس خود تجسّس کر کے لوگوں کے عیوب تلاش کرنا یہ تو بہت بری بات ہے۔

غیبت کی ممانعت: چھٹی بات سورۃ الحجرات کی آیت میں یہ فرمائی گئی: ﴿وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ''اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو''۔ کسی مسلمان بھائی کے پیچھے اس کی کوئی برائی بیان نہ کرو۔ اس حوالے سے حضورﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر اس میں وہ برائی موجود ہو تو؟ اس کے جواب میں آپﷺ نے فرمایا: ((اِنْ كَانَ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَمْ یَكُنْ فِیْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ))(۱) ''اگر وہ عیب اس میں ہے جو تم کہتے ہو تبھی تو وہ غیبت ہے' اور اگر اس میں وہ عیب نہ ہو تو پھر تم نے اس پر بہتان لگایا ہے''۔ ایک شخص کے اندر اگر کوئی عیب ہے یا اس نے کوئی برائی کی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس کا ذکر مت

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الغیبة۔

کرو' ہاں اس کے سامنے اس انداز سے بات کرو تا کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ پیٹھ پیچھے کرو گے تو یہ غیبت ہے اور اس کو اتنا برا کہا گیا کہ: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ یہ بات تو تمہیں بہت بری لگے گی''۔ یعنی کسی مسلمان بھائی کی غیبت کرنا اخلاقی سطح پر وہی فعل ہے جیسے کسی مسلمان بھائی کا گوشت کھانا۔ اس کے اندر مناسبت یہ ہے کہ مردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا' آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اُڑا لیں۔ اسی طرح جو شخص موجود نہیں ہے تو وہ بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ وہ موجود ہوتا تو بتاتا' نہیں بھئی ایسا نہیں ہے' بلکہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ بات میں نے نہیں کی ہے۔ اگر سامنے ہو گا تو وہ کچھ نہ کچھ دفاع تو کر سکتا ہے' لیکن جب موجود ہی نہیں تو وہ اپنی عزت کا دفاع نہیں کر سکتا' جیسے مردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

ایمان سے پہلے طاغوت کا کفر لازم ہے!

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قرآن مجید کا یہ انداز ہے کہ بالعموم پہلے ایک بات کا منفی پہلو بیان کیا جاتا ہے اور پھر مثبت! کلمۂ توحید کی ترتیب بھی یہی ہے کہ پہلے نفی اور پھر اثبات' لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ''نہیں ہے کوئی بھی معبود سوائے اللہ کے''۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (آیت ۲۵۶) ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا''۔ یعنی پہلے طاغوت کا کفر کرنا اور اس سے بغاوت کرنا لازمی ہے اور پھر اللہ پر ایمان کا مرحلہ آتا ہے۔

طاغوت سے مراد اللہ کے سرکش اور اللہ کے باغی ہیں جو اللہ کے بجائے اپنے آپ کو حاکم سمجھ بیٹھیں۔ چاہے وہ حاکم فرعون اور نمرود کی شکل میں ہو یا آج کے جمہوری دور میں عوام کی شکل میں۔ عوام چند لوگوں کو منتخب کر کے اپنے سروں پر اس انداز سے بٹھا لیتے ہیں کہ اب وہ جیسے چاہیں قانون بنائیں' ان کو مکمل آزادی ہے۔ چاہے تو شراب کو جائز قرار دے دیں' ہم جنس پرستی (homosexuality) کو جائز قرار دے دیں' ہم جنس

پرست شادی کے جواز کا فتویٰ دے دیں کہ ایک مرد شوہر ہے اور دوسرا مرد بیوی ہے یا ایک عورت شوہر ہے اور ایک عورت بیوی ہے۔ قانون کی نگاہ میں تو یہ جائز قرار دے دیا گیا‘ حالانکہ یہ فطرت سے بغاوت کا معاملہ ہے۔ اللہ نے عورت کو اور مرد کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ ان کی تخلیق‘ ان کی ساخت اور ان کی نفسیات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ درحقیقت یہ سب طاغوت ہیں۔ اسی طرح میرا اور آپ کا نفس امارہ بھی طاغوت ہے‘ اس لیے کہ ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ’’یقیناً نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے‘‘۔ ہمارے اندر کی حیوانیت کو حلال حرام سے کوئی غرض نہیں ہے‘ زبان کو چٹخارے چاہئیں چاہے حلال سے ہوں یا حرام سے‘ ہمیں بس دولت چاہیے چاہے وہ حلال ذرائع سے آئے یا حرام سے۔ نفس کہہ رہا ہے کہ رشوت پیش ہو رہی ہے تو لے لو‘ اس وقت تمہیں پیسوں کی بڑی ضرورت ہے‘ تمہارے بچے کی فیس ابھی نہیں گئی ہے۔ پھر یہ بھی نفس کا بہکاوا ہے کہ رشوت تو سبھی لیتے ہیں کوئی تم اکیلے تو نہیں لے رہے۔ یہ سارے حیلے نفس سکھاتا ہے‘ اسی لیے ہمارا نفس بھی طاغوت کے زمرے میں آتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ جو بھی اللہ کا باغی ہے وہ درحقیقت طاغوت ہے۔ آج کے دور میں سیکولر ریاست روئے زمین پر سب سے بڑی طاغوت ہے۔ سیکولر کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا کسی مذہب سے‘ کسی آسمانی ہدایت سے‘ کسی آسمانی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے‘ یہ صرف اور صرف انفرادی معاملہ ہے۔ آپ مسلمان ہیں تو انفرادی طور سے شریعتِ محمدیؐ پر عمل کر سکتے ہیں‘ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ آپ نماز پڑھیں‘ روزے رکھیں‘ قرآن کی تلاوت کریں! اسی طرح ہندو منوسمرتی اپنے عقائد و رسوم کے تحت اپنی انفرادی زندگی گزار سکتے ہیں‘ لیکن اجتماعی زندگی میں کسی مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ آج کے دور میں سیکولر ریاست سب سے بڑا طاغوت ہے۔

مسلمان بھائی کی سختی دور کر کے آسانی پیدا کرنا

اب ہم آج کی حدیث کی طرف آتے ہیں۔ اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور یہ صحیح مسلم میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ((مَنْ نَفَّسَ

عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) ’’جس شخص نے کسی مؤمن کی دنیا کی سختیوں (اور دشواریوں) میں سے کسی سختی (یا دشواری) کو دور کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی سختیوں اور دشواریوں میں سے کمی کرے گا‘‘۔ دنیا میں اہل ایمان کے ساتھ اگر حسن سلوک کرو گے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں ملے گا اور اللہ تعالیٰ قیامت کی بڑی شدید سختیوں کو تم سے دور کر دے گا۔ قیامت کی سختیوں کے حوالے سے روایتی طور پر کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے پسینے میں گردنوں تک غرق ہوں گے اور سورج سوا نیزے پر ہوگا۔ یہ چیزیں صرف سمجھانے کے لیے ہیں‘ ورنہ اس دن کی سختی کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سختیوں کو اپنے اُس بندے کے لیے آسان کر دے گا جس نے دنیا میں کسی مسلمان بھائی کی کسی سختی‘ تنگی اور مشکل کو رفع کیا ہوگا۔

دوسری بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی: ((وَمَنْ يَّسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ ‘ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) ’’اور جو شخص کسی تنگدست پر آسانی کرے گا‘ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانی فرمائے گا‘‘۔ یعنی جس نے کسی ایسے شخص پر آسانی پیدا کی جو کسی مشکل میں‘ تنگی میں یا مصیبت میں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس دنیا میں بھی اور پھر آخرت میں بھی آسانیاں پیدا فرما دے گا۔ کوئی مسلمان تکلیف میں ہے اور آپ اس کی تکلیف کے اندر کمی کر کے اس کے لیے کوئی آسانی کا راستہ پیدا کر دیں‘ مثلاً آپ نے کسی کو دو سال کی مدت کے لیے قرض دیا تھا‘ لیکن دو سال کے بعد وہ قرض کی ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہے تب آپ اس کے سر پر سوار ہونے کے بجائے اسے مزید مہلت دے دیں تو یہ بہت اجر و ثواب کا باعث ہے۔ قرآن مجید میں جہاں سود کی حرمت کا حکم آیا ہے‘ وہیں یہ بھی آیا ہے کہ اگر تمہارا مقروض قرض لوٹانے کی حالت میں نہیں ہے تو اس کے لیے مہلت بڑھا دو‘ اور اگر اس کی تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے قرض معاف ہی کر دو تو یہ سب سے بہتر ہے۔ یہ تمہارا مسلمان بھائی ہے اور اس نے اپنی مجبوری میں تم سے قرض لیا تھا۔ پھر ظاہر بات ہے کہ تم نے بھی اپنی اضافی دولت سے ہی اسے قرض دیا تھا‘ اب اگر اس

قرض کو صدقہ کرتے ہوئے معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے بہت دے گا۔

انسان کے پاس جو اضافی دولت ہے‘ اس کے بارے میں قرآن مجید میں تو یہ اصول بیان کیا گیا ہے: ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ’’(اے نبیﷺ) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟ آپ انہیں بتا دیجیے کہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے (اسے صدقہ کر دو)‘‘۔ اس حوالے سے یاد رکھیے کہ یہ روحانی تقاضا ہے‘ جبکہ قانونی تقاضا اس سے مختلف ہے کہ آپ ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے ــــــ بعض صحابہ کرام ؓ نے سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں موجود اسلامی معیشت کے روحانی تقاضے کو قانونی سمجھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ کسی بھی مقدار میں سونا چاندی اپنے پاس رکھنا مطلقاً حرام ہے۔ ان میں حضرت ابوذر غفاری ؓ جیسے صحابی بھی تھے۔ ان کے اندر چونکہ زہد انتہائی درجے کا تھا تو اس کا یہ مظاہرہ ہوا ــــــ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ آپ کے پاس جو دولت ہے‘ اس میں سے آپ نے زکوٰۃ ادا کر دی ہے تو باقی مال آپ کا ہے۔ آپ اس کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور وہ آپ کی اولاد کو منتقل ہو سکتا ہے۔ اگر اپنے پاس کچھ رکھنا ہی نہیں ہے تو وراثت کا قانون آخر کیسے لاگو ہو گا؟

اسلامی نظامِ معیشت پر میرا ایک کتابچہ ہے: ’’اسلام کا معاشی نظام‘‘ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام میں معیشت کے دو نظام ہیں‘ ایک ہے روحانی اور احسانی سطح پر اور ایک ہے قانونی سطح پر۔ قانونی سطح پر یہ ہے کہ آپ نے حلال ذرائع سے مال کمایا اور وہ مال نصاب سے آگے بڑھ گیا اور آپ نے اس میں سے زکوٰۃ دے دی تو اب باقی مال آپ کا ہے اور قانونی طور پر آپ اس کے مالک ہیں۔ جبکہ روحانی سطح پر یہ ہے کہ جو مال باقی بچ گیا ہے اس کو اللہ کے راستے میں دے دو۔ چنانچہ زیر مطالعہ حدیث میں رسول اللہﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اگر تم اپنے کسی تنگ دست بھائی کے لیے آسانی پیدا کرو گے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں تمہارے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔

مسلمان کی پردہ پوشی کرنا

زیر مطالعہ روایت میں رسول اللہﷺ نے تیسری بات یہ فرمائی: ((وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ)) ’’جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا‘ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا‘‘۔ آپ کی نظر میں کسی کا کوئی عیب آ گیا ہے ــــــ تجسس تو آپ نے نہیں کرنا اور ٹوہ میں نہیں لگے رہنا‘ اس لیے کہ سورۃ الحجرات میں واضح حکم ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ’’اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو‘‘۔ آپ نے خود سے تو کسی کا عیب تلاش نہیں کیا‘ لیکن ایک چیز آپ کے سامنے آ ہی گئی تو اس پر پردہ ڈالو۔ یہ نہیں کہ اس کا ڈھنڈورا پیٹو اور لوگوں کے اندر اس کا چرچا کرنا شروع کر دو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ کسی صورت پسند نہیں ہے‘ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ﴾ (النور:۱۹) ’’بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان میں بے حیائی کا چرچا ہو‘ اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے‘‘۔ کسی کا کوئی عیب‘ کوئی گناہ یا بے حیائی کی کوئی بات آپ کے علم میں آ جائے تو اس کو چھپاؤ‘ اس کا چرچا مت کرو۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا‘ عیب پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا۔ آخر تمہارے اندر بھی تو کوئی عیب ہے نا‘ بے عیب ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ کون ہے جس میں کوئی خطا نہیں ہے‘ کوئی کمی نہیں ہے؟ وہ حدیث بھی یاد کر لیجیے: ((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ))(۱) کہ تمام بنی آدم نہایت خطا کار ہیں اور ان خطا کاروں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو توبہ کریں‘ رجوع کریں‘ گناہ پر اصرار نہ کریں اور کسی گناہ پر ڈیرا ڈال کر بیٹھ نہ جائیں۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر کہیں بارش کی وجہ سے کیچڑ بن گیا ہے‘ آپ وہاں سے گزر رہے ہیں‘ آپ کا پاؤں پھسلا اور آپ

(۱) سنن ابن ماجه‘ كتاب الزهد‘ باب ذكر التوبة۔ وسنن الترمذی‘ ابواب صفة القيامة والرقائق والورع۔

گر گئے۔ اب آپ وہاں پڑے تو نہیں رہتے‘ بلکہ فوراً اٹھتے ہیں اور کپڑے صاف کر کے آگے چل پڑتے ہیں۔ اسی طریقے سے کہیں نفس امارہ کے بہکاوے کی وجہ سے آپ سے کوئی لغزش ہوگئی یا ماحول کے اثرات کے تحت آپ سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو فوراً اللہ کی جناب میں توبہ کرو۔ اس بارے میں سورۃ النساء میں ارشاد ہے کہ اگر فوراً توبہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے ذمے تمہاری توبہ کو قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ (آیت ۱۷) ”اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں‘ پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں‘ تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔“

مسلمان بھائی کی مدد کرنا

چوتھی بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ)) — آپ اندازہ کیجیے کہ کس قدر پیاری تعلیمات ہیں اور کس قدر عمدہ اندازِ بیان اور جامع الفاظ ہیں — ”اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے“۔ آپ اپنے بھائی کے کام میں وقت لگا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں لگ جائے گا اور آپ کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص مظلوم ہے اور وہ آپ سے آکر کہتا ہے کہ فلاں حاکم کے پاس جا کر میری بات بتائیے‘ میری بات کوئی نہیں سن رہا۔ اگر اس کی بات سچ ہے اور آپ جا کر اس کی سفارش کرتے ہیں تو یہ شفاعت حسنہ کہلاتی ہے اور اس کا بڑا اجر و ثواب ہے۔ اب آپ اس کی مدد کے لیے جا رہے ہیں تو ظاہری بات ہے کہ آپ کا وقت بھی لگے گا تو اتنے عرصے تک آپ کے سارے کام اللہ سنبھالے گا۔

اس حوالے سے ایک واقعہ بہت مشہور ہے‘ مکہ میں ایک تاجر آیا اور ابوجہل نے اس سے بہت سا مال و اسباب خریدا‘ لیکن پیسے نہیں دیے۔ اب وہ بیچارہ لوگوں سے فریاد کرتا پھر رہا ہے‘ لیکن کوئی اس کی مدد کے لیے تیار نہیں ہے۔ ایک جگہ پر بہت سے سردار

بیٹھے ہوئے تھے‘ وہ تاجر ان کے پاس گیا اور ان سے فریاد کی کہ ابوجہل میری رقم نہیں دے رہا‘ تو انہیں شرارت سوجھی۔ انہوں نے کہا وہ شخص جو وہاں نماز پڑھ رہا ہے‘ اس کے پاس جاؤ‘ وہ تمہارا مال دلوا سکتا ہے۔ وہ شخص نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تھے۔ تاجر نے حضور اکرم ﷺ کے پاس جا کر ساری بات بتائی اور مدد کی درخواست کی تو آپؐ فوراً اس کے ساتھ چل پڑے۔ ابوجہل حضور ﷺ کا بدترین دشمن تھا‘ اس کے باوجود آپؐ اُس تاجر کے ساتھ ابوجہل کے گھر گئے اور دروازے پر جا کر دستک دی۔ ابوجہل باہر آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کا مال ادا کرو۔ وہ فوراً اندر گیا اور خاموشی کے ساتھ جا کے مال لے آیا —— یہ رعب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو دیا تھا۔ آپ ﷺ خود فرماتے ہیں: ((بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ))(۱) ”میں جوامع الکلم کے ساتھ بھیجا گیا ہوں اور رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے“ —— ظاہر بات ہے کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک کا رعب جب ابوجہل کے اوپر پڑا تو اس نے بلا چون و چرا اس کا مال لا کے دے دیا۔ دیکھئے آپ ﷺ ایک انجان بندے کی مدد کے لیے اس کے ساتھ چلے اور اس کے پاس جا رہے ہیں جو آپؐ کا بدترین دشمن ہے۔ صرف اس لیے کہ کم سے کم اس مظلوم کی کوئی دادرسی ہو جائے۔

طلبِ علم کی فضیلت

زیر مطالعہ حدیث کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے‘ پہلے حصہ میں حسنِ معاشرت کے اصولوں کو بیان کیا گیا‘ جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں طلبِ علم اور درس و تدریس کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے —— الحمد للہ‘ میں نے اس کام میں پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ لگایا ہے۔ میں جب میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا (۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک) تو اس زمانے میں بھی میرا درسِ قرآن ہوتا تھا اور وہ پسند کیا جاتا تھا۔ میڈیکل کی تعلیم کے ساتھ قرآن سے بھی مناسبت اللہ نے عطا فرما دی تھی‘ لیکن اس کے بعد پھر میری زندگی کا اصل کام ہی یہ رہا: قرآن پڑھنا پڑھانا‘ سمجھنا سمجھانا‘ سیکھنا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجهاد‘ باب قول النبی ﷺ نصرت بالرعب مسیرة شهر۔

سکھانا اور قرآن کی تعلیم کو عام کرنا اور لوگوں تک پہنچانا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے نوجوان ایسے تیار ہو گئے ہیں جو اسی انداز میں اب درس دے رہے ہیں اور قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے' ورنہ ایک اکیلے آدمی سے کیا ہوگا۔ میرے اس کام کو آگے لے کر چلنے والے اب بہت سے ہیں' گویا میری محنت پھل لا رہی ہے۔

طلبِ علم اور اس کی فضیلت کے حوالے سے یہ حدیث بہت اہم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں فرمایا: ((وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا......)) ''جس شخص نے حصولِ علم کے لیے کوئی راستہ طے کرنا شروع کیا......'' آپ کو معلوم ہے کہ جب احادیث جمع کی گئی ہیں تو اس کے لیے محدثین نے دور دراز کے سفر کیے۔ ایسا بھی ہوا کہ حدیث جمع کرنے والے صاحب کو معلوم ہوا کہ فلاں شہر مثلاً بصرہ یا بغداد میں ایک صاحب موجود ہیں جو اس حدیث کی روایت ایسی سند سے کرتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد کم ہے تو وہ لمبا سفر کر کے گئے اور جا کر کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ حضور ﷺ کی یہ حدیث اس سند سے روایت کرتے ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا: جی ہاں' یہ حدیث میں اس طرح روایت کرتا ہوں۔ بس وہ حدیث سنی اور فوراً واپس آ گئے اور کہا کہ میں صرف اس مقصد کے لیے آیا تھا اور اس مقصد میں کسی اور چیز کو میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔

اسی طرح بعض لوگ مراکزِ علمی کی طرف سفر کرتے تھے۔ جیسے مشہور واقعہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کو ان کی والدہ نے حصولِ علم کے لیے روانہ کیا تو کچھ اشرفیاں ان کی واسکٹ کے اندر سی دی تھیں کہ وقتِ ضرورت ان کے کام آئیں گی۔ راستے میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالا۔ ڈاکوؤں کا سردار ہر ایک سے پوچھتا تھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ سب کہتے کہ کچھ نہیں ہے' لیکن جب تلاشی ہوتی تھی تو کچھ نہ کچھ نکل آتا تھا۔ اس نوجوان سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تو اس نے کہا میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں۔ سردار نے کہا: کہاں ہیں' ہمیں تو کہیں نظر نہیں آئیں۔ انہوں نے کہا کہ میری واسکٹ

کے اندر سلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کھول کے دیکھا تو واقعی وہاں چالیس اشرفیاں تھیں۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ ڈاکوؤں کا سارا قافلہ تائب ہو گیا۔ وہ اشرفیاں بھی انہیں واپس کیں اور باقی بھی جن کا مال لوٹا تھا' وہ واپس کیا۔ پھر ان کی زندگی نیکی کے حصول میں لگ گئی۔ معلوم ہوا کہ علم کے حصول کے لیے سفر کرنے میں یقیناً خیر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ)) ''جو شخص حصولِ علم کے لیے کوئی سفر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی بدولت اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے''۔ طلب علم کے لیے سفر گویا جنت کی طرف سفر ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں کون سا علم مراد ہے۔ ایک علم تو وہ ہے جسے سیکھنے کے لیے ہم امریکہ یا کسی اور ملک جاتے ہیں۔ مثلاً فلاں انجینئرنگ پڑھنے جا رہے ہیں' فلاں کورس کرنے جا رہے ہیں' پی ایچ ڈی یا ایم بی بی ایس کرنے جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ علم نہیں' فنون ہیں۔ جیسے ایک موچی جوتیاں گانٹھ کر پیسے کما رہا ہے تو جوتیاں گانٹھنا ایک فن ہے' اس لیے کہ ہر شخص جوتیاں نہیں گانٹھ سکتا۔ اسی طرح بڑھئی کے پاس ایک فن ہے اور وہ اپنے فن کو استعمال میں لا کر لکڑیوں سے مختلف چیزیں بناتا ہے۔ یہی معاملہ ایک بڑے سرجن کا ہے کہ وہ بھی جسم کو چیرتا ہے' اس میں سے کوئی غلط چیز نکال کر پھر سی دیتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹری' انجینئرنگ وغیرہ یہ علوم نہیں' فنون ہیں۔ اصل علم تو علم ہدایت ہے جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا مصداق وہ شخص ہے جو علمِ ہدایت کے حصول کے لیے سفر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سفر کی بدولت اس کے لیے جنت کا سفر آسان کر دیتا ہے۔

تلاوتِ قرآن اور درس و تدریس کی فضیلت

آگے سنیے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ......)) ''اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرنے کے لیے اور

آپس میں ایک دوسرے کو درس دینے کے لیے......'' ایک تو ہمارا (یک طرفہ) درس ہوتا ہے' یہ تھوڑا لمبا ہوتا ہے' اس لیے کہ اس میں آیت کے ہر ہر لفظ کے بارے میں بتانا پڑتا ہے کہ اس کے یہ معانی ہیں' اس کی یہ ترتیب ہے' یہ ترجمہ ہے اور پھر اس کا مفہوم یہ ہے۔ یہاں لفظ ''تدارس'' آیا ہے۔ تدارس کا عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ یعنی آپ ایک سٹڈی سرکل بنا کر بیٹھ جائیں۔ ایک آیت پڑھی گئی تو ہر ایک سے باری باری پوچھا گیا کہ آپ نے اس سے کیا سمجھا؟ اس طرح سب نے جو سمجھا وہ باہمی تبادلہ کر دیا۔ یہ ایک بہت اچھی روایت ہے اور میں نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں انگلینڈ میں یہ دیکھا تھا۔ پاکستانی لڑکوں کا ہاسٹل تھا' وہاں یہ ہوتا تھا کہ جمعہ کے بعد لڑکے بیٹھتے تھے —— لڑکے بھی وہ تھے کہ کوئی پی ایچ ڈی کر چکے تھے' کوئی کر رہے تھے' کوئی ایم اے یا ایم ایس سی کے سٹوڈنٹ تھے۔ ان میں کوئی بھی پرائمری' ہائی سکول یا کالج لیول کے سٹوڈنٹ نہیں تھے —— وہ نمازِ جمعہ کے بعد حلقہ بنا کر بیٹھتے۔ قرآن مجید کا ایک رکوع ایک نے پڑھا' اگر اس میں اس نے کوئی غلطی کی تو اس کی تصحیح کر دی گئی۔ وہی رکوع دوسرے نے پڑھا' پھر تیسرے نے پڑھا تاکہ تجوید صحیح ہو جائے۔ پھر ان کے ذمے یہ ہوتا تھا کہ ہر کوئی مختلف تفسیر پڑھ کے آئے اور اپنا اپنا بیان کرے —— تو اسے ہم کہیں گے سٹڈی سرکل۔ یہ تدارس ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے بہت فضائل کا باعث قرار دیا ہے۔

سکون اور اطمینان کے نزول کا باعث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں اللہ کی کتاب کو پڑھنے کے لیے اور آپس میں باہم ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے (تدارس) کے لیے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے: ((اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ)) ''ان پر سکینت نازل ہوتی ہے''۔ یعنی اللہ کی طرف سے سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے جو ایمان کا اصل حاصل ہے۔ ایمان' امن سے ہے' اسی لیے حضور ﷺ مہینے کا نیا چاند دیکھتے تھے' تو کہتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ' رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ))(۱) ''اے اللہ اس چاند کو ہمارے لیے امن'

(۱) سنن الدارمی' کتاب الصوم' باب ما یقال عند رؤیۃ الھلال۔

ایمان' سلامتی اور اسلام کا باعث بنا۔ (اے چاند) میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے''۔ سلامتی' اسلام سے ہے اور امن' ایمان سے۔ امن انسان کی داخلی کیفیت ہے' جبکہ سلامتی ایک معاشرتی معاملہ ہے۔ پہلے امن ہوگا اور بعد میں معاشرہ میں سلامتی کا دور دورہ ہوگا۔ امن و سلامتی بہت ضروری ہے تاکہ کسی سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے' کوئی کسی کو ناحق قتل نہ کرے' کوئی کسی کا مال نہ چھینے' لہٰذا ایک دوسرے کے لیے سلامتی والے بن جاؤ۔ اہلِ جنت کے بارے میں آیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کریں گے: ﴿اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾﴾ (الواقعہ)۔ حضور ﷺ نے بھی فرمایا کہ اپنے مابین سلام کو عام کرو۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں' لیکن اگر کہیں بڑا چھوٹے کو سلام کرے تو دوگنا ثواب ہو جائے گا اور چھوٹے کو ایک طرح سے ادب کی تعلیم ہو جائے گی کہ مجھے پہلے سلام کرنا چاہیے' لہٰذا ہر مسلمان کو سلام کرو۔ ایک حدیث میں تو بڑے پیارے الفاظ آئے:

((لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُمْ، اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ))(۱)

''تم ہرگز جنت میں داخل نہیں ہو سکو گے جب تک کہ مؤمن نہ ہو' اور تم ہرگز مؤمن نہ ہو سکو گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہاری راہنمائی نہ کروں اس چیز کی طرف کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو آپس میں محبت پیدا ہو جائے: اپنے درمیان سلام کو عام کرو!''

دنیا میں greeting کے اور بھی الفاظ ہیں' مثلاً گڈ مارننگ' گڈ ایوننگ' ہائے' ہیلو' نمستے وغیرہ' لیکن ان میں بہترین ''السلام علیکم'' ہے اور اس کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ اس کے جواب کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم اس سے بڑھ کر جواب دو' نہیں تو کم سے کم اتنا جواب تو لازمی دو۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا﴾ (آیت ۸۶) ''اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو''۔ بعض لوگ اپنے تکبر میں سلام کے جواب

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون......

میں بس سر ہلا دیتے ہیں۔ یہ رویہ صحیح نہیں ہے اور یہ تکبر کی علامت ہے۔ کسی نے آپ کو ''السلام علیکم'' کہا ہے تو جواب میں آپ ''وعلیکم السلام'' کہیں، بلکہ بہتر ہے کہ بڑھا کر ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہیں۔

رحمت اور فرشتوں کا گھیر لینا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے گھر میں جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، درس و تدریس کرتے ہیں تو ان پر ایک تو سکون و اطمینان کی کیفیت نازل ہوتی ہے، دوسری فضیلت ان کی یہ ہے کہ: ((وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ)) ''اور رحمت خداوندی انہیں ڈھانپ لیتی ہے''۔ ان پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ میرا کلام پڑھ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ تیسری فضیلت یہ بتائی گئی کہ: ((وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ)) ''اور فرشتے ان کے گرد چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیتے ہیں''۔

اللہ کا فرشتوں کے سامنے اُن کا تذکرہ کرنا: مندرجہ بالا تین فضائل کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ایک اور فضیلت بھی بیان فرمائی ہے جو ان سب سے اعلیٰ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ)) ''اللہ ان کا ذکر کرتا ہے ان کے سامنے جو اس کے پاس ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ملائکہ مقربین ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنے ان نیک بندوں کا تذکرہ کرتا ہے —— ملائکہ کے بھی کچھ درجے ہیں۔ ملائکہ کا ایک گروہ دنیا کے انتظام و انصرام میں لگا ہوا ہے۔ ایک گروہ ملائکہ مقربین کا ہے جو اللہ تعالیٰ سے نہایت قرب رکھتے ہیں۔ پھر وہ آٹھ فرشتے ہیں جو حاملینِ عرش ہیں، اللہ تعالیٰ کے عرش کو تھامے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ چنانچہ فرشتوں کے اندر بھی حفظِ مراتب کا معاملہ ہے —— لہٰذا اللہ تعالیٰ ملائکہ مقربین میں ان کا ذکر کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم تو کہتے تھے یہ آدم زمین میں خونریزی کرے گا اور فساد مچائے گا، لیکن دیکھو میرے یہ بندے بغیر کسی دنیوی غرض کے صرف میرے کلام کو سمجھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اسی دور میں، اسی لاہور میں سات سات سو آدمی اتوار کی صبح کو میرا

درس سننے کے لیے مسجد شہداء میں جمع ہوتے رہے ہیں۔ اس درس میں کوئی سیاست کی بات نہیں ہوتی تھی، نہ حکومت کے خلاف اور نہ اپوزیشن کے حق میں۔ اسی طرح اس میں فرقہ واریت کی بھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی، نہ اختلافی مسائل ہوتے تھے اور نہ ہی قصے کہانیاں ہوتی تھیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی کتاب پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا ہوتا تھا۔ جو اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے اسے کھل کر بیان کیا جاتا تھا اور اس ضمن میں کوئی کتمان نہیں ہوتا تھا، کوئی بات چھپائی نہیں جاتی تھی۔ ایسی محافل کے بارے میں ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے فرشتوں کے سامنے کرتا ہے۔

زیر مطالعہ جملہ میں ''فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللّٰهِ'' کے الفاظ آئے ہیں اور اس کا مصداق اولاً مسجد ہی ہوگی، اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں۔ ویسے تو ہم ''بیت اللہ'' خانہ کعبہ اور مسجد حرام کو کہتے ہیں، لیکن آپ ﷺ کے فرمان کی رو سے کُل روئے زمین کی مسجدیں کعبہ کی بیٹیاں ہیں۔ جبکہ شارحین حدیث نے اس کو عام رکھا ہے کہ یہ صرف مسجد کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ جس جگہ کو بھی آپ نے تلاوتِ قرآن مجید اور درس و تدریس کے لیے خاص کیا ہے تو گویا اس کا شمار بھی اللہ کے بیوت میں ہوگا۔

ایک بار پھر سن لیجیے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللّٰهِ)) ''نہیں جمع ہوتے کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں'' ((يَتْلُونَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ)) ''اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے کو افہام و تفہیم کرتے ہوئے'' ((إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ)) ''مگر یہ کہ ان پر سکینت نازل ہوتی ہے'' ((وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ)) ''اور رحمت خداوندی ان کو ڈھانپ لیتی ہے'' ((وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ)) ''اور فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں'' ((وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ)) ''اور اللہ ان کا تذکرہ اُن فرشتوں سے کرتا ہے جو اُن کے پاس ہیں'' کہ میرے بندے میرے فلاں گھر میں یا فلاں مقام پر میری کتاب کو پڑھنے کے لیے جمع ہیں اور اس میں ان کا کوئی اور مقصد نہیں ہے، کوئی دُنیوی غرض و غایت نہیں ہے سوائے میری کتاب سے محبت کے۔

بغضِ صحابہؓ درحقیقت بغضِ رسولؐ ہے!

میں نے آپ کو یہ حدیث سنائی تھی:

((اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِی لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا بَعْدِی ، فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ ، وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ))(۱)

’’میرے بعد میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرنا اور ان کو ہدفِ ملامت نہ بنانا‘ اس لیے کہ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔‘‘

یعنی میرے اصحاب پر تنقید کرنے‘ سب وشتم کرنے‘ ان کی برائی بیان کرنے سے بچو۔ جو کوئی بھی ان سے محبت کرتا ہے وہ میری محبت کی وجہ سے کرتا ہے‘ اس لیے کہ وہ نسبتِ محمدیؐ کے ساتھ صحابی بنا ہے۔ چنانچہ جس کے دل میں میری محبت ہے تو اس کے دل میں میرے صحابہؓ کی محبت بھی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ جو میرے صحابہ سے بغض رکھے گا تو اس کا اصل بغض مجھ سے ہے۔ میرے صحابہ پر جو بغض نکالتا ہے‘ ان پر سب وشتم کرتا ہے‘ تبرا کرتا ہے‘ انہیں برا بھلا کہتا ہے‘ ان پر تنقیدیں کرتا ہے تو درحقیقت اسے اُن سے نہیں‘ مجھ سے بغض ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص آنحضورﷺ پر تو اپنا بغض نکال نہیں سکتا‘ اس لیے کہ آپﷺ کو کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسے آسمان پر تھوکنا۔ اب تھوک آسمان پر تو جائے گا نہیں‘ اپنے منہ پر ہی آئے گا۔ آپﷺ تو اتنی بلند ترین شخصیت ہیں کہ کوئی بہت ہی بدنصیب اور بہت ہی بدطینت انسان ہوگا جو آپﷺ کی ذات پر طعن وتعریض کرے گا۔ جو کچھ بھی ڈنمارک میں یا مغرب میں کہیں اور ہو رہا ہے وہ تو دشمن کر رہے ہیں‘ لیکن نام نہاد مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے آپﷺ کی ذات پر رکیک حملے کیے‘ چاہے وہ سلمان رشدی ہو یا تسلیمہ نسرین بنگالی‘ جو نام کے مسلمان تھے۔ بہرحال عام طور پر لوگ حضورﷺ کی ذات پر حملہ نہیں کرتے بلکہ آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حملہ

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب المناقب‘ باب فی سب اصحاب النبیﷺ۔

کرتے ہیں‘ اور اس حملے کی زد دراصل حضورﷺ کی ذات پر پڑتی ہے‘ کیونکہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پھل کڑوا ہوگا تو لوگ کہیں گے اس درخت کا پھل اچھا نہیں ہے اور اگر پھل اچھا ہے تو لوگ درخت کی تعریف کریں گے۔ گویا بغضِ صحابہؓ دراصل بغضِ رسولؐ ہے۔ اسی لیے صحابہؓ پر تنقید کرنے اور طعن وتشنیع سے بہرصورت بچنا چاہیے۔

کامیابی کا دار و مدار حسب ونسب پر نہیں‘ اعمال پر ہے

زیر مطالعہ حدیث میں آخری بات رسول اللہﷺ نے یہ فرمائی: ((وَمَنْ بَطَّأَ بِہٖ عَمَلُہٗ لَمْ یُسْرِعْ بِہٖ نَسَبُہٗ)) ’’جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے رکھ دیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا‘‘۔ یعنی اصل چیز انسان کا عمل ہے‘ حسب ونسب سے انسان آگے نہیں بڑھتا۔ کسی کو اس چیز کا گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں‘ میں فلاں نسل سے ہوں۔ یہودیوں کو اپنی نسل پر فخر تھا اور وہ کہتے تھے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ط﴾ (المائدۃ:۱۸) ’’ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں‘‘۔ ہمارے ہاں بھی اسی طرح کے معاملات ہوتے ہیں۔ سیدزادہ اپنے نسب پر فخر کرتا ہے کہ میں سیدزادہ ہوں۔ حسب نسب اپنی جگہ ہے‘ اسلام اس کی نفی نہیں کرتا‘ لیکن اگر اس کا اپنا عمل پیچھے رہ گیا اور اس کے عمل نے اسے پیچھے چھوڑ دیا تو پھر یہ محض نسبت کی وجہ سے آگے نہیں آ سکتا۔ فارسی میں بڑی اچھی کہاوت ہے: ’’پدرم سلطان بود!‘‘ (میرا باپ بادشاہ تھا!) اب اس پر کوئی کہے گا: ’’تراچہ؟‘‘ یعنی تمہارا باپ تو سلطان تھا‘ لیکن تم کیا ہو؟ لہٰذا آپﷺ نے فرمایا کہ جس کا عمل اسے پیچھے چھوڑ دے اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن وحدیث کی ان تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ oo

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات)

ابراہیمی نصابِ تعلیم و تربیت

نبویؐ فہم وفراست کا شاہکار

انسانیت پر احسانِ عظیم

از محمد رشید عمر ☆

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی تسلیم و رضا کے حوالے سے اس قدر کامل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نہ صرف ''خلت'' کا مقام عطا فرمایا' بلکہ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ﴾ (المُمتحنة: ٤)

''یقیناً تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ تھے' ان کے طرزِ عمل میں۔''

انسانی خدمات کے اعتبار سے حضرت ابرہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احسانات اس قدر ہیں کہ پوری انسانیت ہر وقت ان پر درود و سلام بھیجتی رہے تب بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کو اپنے گھر کی تعمیرِ نو کی سعادت بخشی اور اس گھر کو پوری انسانیت کے لیے اجتماع گاہ اور امن کی جگہ بنا دیا۔ آپ علیہ السلام ہی کے ذریعے تمام عبادتوں کی جامع عبادت' حج کا اعلان کروایا گیا اور اس منادی کو تمام انسانوں کے قلوب و اذہان تک پہنچانے کا بندوبست اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ یہ عبادت کیسے کرنی ہے؟ وہ مناسک بھی ذاتِ باری تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو سکھائے' جن کا تسلسل قیامت تک رہے گا۔ آپ علیہ السلام انسانیت کے ایسے محسنِ اعظم ہیں کہ آپؑ کے بعد انسانی رشد و ہدایت کا سلسلہ بھی آپؑ کی اولاد میں جاری فرما دیا' جو کسی اور نسل میں منتقل نہیں ہوا۔ آپ علیہ السلام نے خود بھی اور فرزندانِ ابراہیم نے بھی حتی المقدور اس فریضہ کی ادائیگی میں کسی کمی

☆ مقامی امیر' فیصل آباد جنوبی

کوتاہی یا سستی کا مظاہرہ نہیں کیا' چاہے کتنے ہی کٹھن اور مشکل حالات اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ حضرات اسحٰق' یعقوب' یوسف' داؤد' سلیمان' ایوب' موسیٰ' ہارون' زکریا' یحییٰ' عیسیٰ' الیاس' یسع' یونس اور لوط علیہم السلام سب کے سب اولادِ ابراہیمی کے چمن کے پھول ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دعوتِ دین کا بے نظیر ملکہ عطا فرمایا تھا۔ مدمقابل چاہے قوت و اقتدار کا حامل فرد ہو یا دلیل بازی میں پوری قوم مدمقابل آ کھڑی ہو' آپؑ نے دعوتِ حق کو اس طرح پیش فرمایا کہ سب اپنے گریبانوں میں جھانکنے پر مجبور ہو گئے' چاہے ہٹ دھرمی قبولِ حق میں رکاوٹ بن گئی ہو۔ ہدایتِ خداوندی انسان کی کتنی بڑی ضرورت ہے' اس کا ادراک کس قدر واضح تھا کہ آپ علیہ السلام اس ضمن میں اپنی دلی تمنا اپنے رب کے حضور بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١٢٩﴾ (البقرة)

''پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول انہی میں سے مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات کی تلاوت کر کے سنائے اور انہیں کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بیشک تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہ صرف انسانیت کے لیے رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی تجویز پیش کی' بلکہ اس رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیمی و تربیتی نصاب کیا ہونا چاہیے' وہ بھی خود تجویز فرمایا۔ یہ نصاب آپؑ کی فہم و فراست کا شاہکار ہے' جو تین نکات پر مشتمل ہے:

۱) تلاوتِ آیات: کلام اللہ کی آیات کی تلاوت نہ صرف ایمان کی دلیل ہے بلکہ ایمان کی آبیاری کا سب سے بڑا منبع اور سرچشمہ ہے۔ بلاواسطہ اور بالواسطہ ایمان کی دعوت اس میں موجود ہے۔

۲) تعلیمِ کتاب و حکمت: اس سے مراد شریعت کے احکام کی تعلیم اور ان کے اندر انسانیت کے لیے پوشیدہ فوائد اور اسرار و رموز سے واقف کرانا ہے۔ جیسے ناحق قتل کرنے والوں کو قصاص میں قتل کرنا شریعت کا حکم ہے۔ یہ نہ ظلم ہے نہ زیادتی' نہ ہی کوئی تخریبی عمل' بلکہ اس میں انسانیت کی تعمیر اور بقائے حیات مضمر ہے۔ اسی طرح معاشرتی بے راہ روی' بے حیائی اور برائی کا علاج نماز کے شرعی حکم پر عمل کرنے سے ہو جاتا ہے' وغیرہم۔ اس موضوع پر علمائے ربانی کی

تصانیف موجود ہیں۔

۳) تزکیہ: ذاتِ باری تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تخلیق اس طرح فرمائی ہے کہ ایک طرف اس میں خیر کے رجحانات ہیں تو دوسری طرف شر پسندی کا میلان اور اس کی رغبت ہے۔ کامیابی کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ نفسِ انسانی میں خیر پسندی کو پروان چڑھایا جائے‘ اسے اپنے مالک کی اطاعت گزاری کا خوگر بنایا جائے‘ اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ کاموں سے نفرت اس میں بھری جائے‘ حرام کاری اور بدکاری سے اسے بچایا جائے۔ یہی تزکیۂ نفس ہے۔ انسانی باطن امراضِ خبیثہ سے جتنا پاک ہوگا اتنا ہی وہ احکامِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار اور بے چین ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابرہیم علیہ السلام کی تجویز کردہ گزارشات یعنی بعثتِ نبی آخرالزماں ﷺ اور ان کی امت کے لیے تعلیمی و تربیتی نصاب‘ دونوں باتیں قبول فرمالیں۔ چنانچہ آپؑ کے ہزاروں سال بعد جب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو منصبِ رسالت سے سرفراز فرمایا تو ابراہیمی نصابِ تعلیم و تربیت کا بھی اعلان فرما دیا۔ یہ تعلیمی و تربیتی نصاب انہی تین نکات پر مشتمل تھا جن کی تجویز دعا کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں پیش کی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی منظور کردہ ترتیب میں دوسرے نمبر پر تزکیہ کو رکھا گیا اور تیسرے نمبر پر تعلیم کتاب و حکمت کو۔ کیا اس کو ابراہیم علیہ السلام کی تجویز میں ترتیب کی غلطی کہا جاسکتا ہے؟ نہیں‘ ہرگز نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ان نکات کی ترتیب ان کے اپنے ایمان اور عمل کے احوال وظروف کی روشنی میں تھی۔ آپؑ خود ایمان اور عمل میں یکسوئی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور ایمان کے بعد شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونا آپؑ کے لیے ذرا بھی گراں نہ تھا۔ مشکل سے مشکل مطالبے پر پورا اترنا بھی آپؑ کے لیے بہت آسان تھا۔ آپؑ کو ایمان کی منازل ذاتِ باری تعالیٰ نے دو طرح سے طے کروائیں۔ ایک آپؑ کے اپنے طلب کرنے پر یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت اور خلت کے تعلق کی وجہ سے جب اپنی آنکھوں سے قدرتِ کاملہ کی نشانی دیکھنے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے سامنے پرندوں کو زندہ کر کے دکھا دیا۔ دوسرے باری تعالیٰ نے خود زمین و آسمان میں اپنی کارفرمائی آپؑ کے سامنے آشکارا فرما کر ایمان و یقین کی دولت سے آپؑ کو نوازا۔ اس لیے شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونا آپؑ کے لیے آسان تھا۔ چنانچہ آپؑ نے اپنی تجویز میں ایمان کے بعد تعلیم کتاب و حکمت کو دوسرے نمبر پر اور باطنی نورانیت کے لیے تزکیہ تیسرے نمبر پر رکھا۔

اللہ تعالیٰ نے منظور کردہ ترتیب میں ایمان کے بعد تزکیہ کو رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات علیم و خبیر اور حکیم ہے‘ آنے والی نسلوں کی خوبیوں اور خامیوں کو جاننے والی ہے۔ معاملہ حضور نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت اور آپؐ کی امت کا تھا۔ یعنی امتِ وسط‘ خیر امت اور قیامت تک کی انسانیت (اُمتِ دعوت) کا تھا۔ ﴿عَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا﴾ کے مصداق‘ ایمان کے اقرار کے بعد انسانوں کی باطنی صفائی کا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ لوگوں کی اصلاحِ باطن کے بعد انہیں احکامِ شریعت کو قبول کر کے ان پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ عمل کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے تزکیہ نفس ضروری تھا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے اس کو دوسرے نمبر پر رکھا تاکہ عمل کی راہ آسان ہو جائے۔ سیرت النبی ﷺ سے یہ بات واضح ہے کہ تیرہ سالہ مکی زندگی میں شریعت کے احکام نازل نہیں کیے گئے۔ تلاوتِ آیات‘ اِنذار و تبشیر‘ نیکی اور بدی‘ حلال و حرام کی اہمیت اور ایمانیات کے مدلل مضامین بیان ہوتے رہے۔ ہجرت کے بعد معاملات کو شریعت کے تابع کیا گیا۔

تزکیہ نفس سے غفلت ہی مسلمانوں کی قوت کے زوال کا سبب بنی۔ حکمران طبقہ جب نفسیاتی شرور کا شکار ہوا تو زوال کو عروج کی طرف موڑنا محال ہوگیا۔ متحدہ ہندوستان میں تحریکِ شہیدینؒ کی ناکامی کے اسباب میں بھی یہ بات اہم قرار دی جاتی ہے کہ جب سید احمد شہید رحمہ اللہ نے سرحدی علاقوں میں شریعت کا نفاذ کیا تو خوانینِ سرحد آپ کے معاون بننے کی بجائے دشمن بن گئے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ آگے بڑھ کر انگریزوں کو شکست دے کر ہندوستان میں دوبارہ سے اسلامی حکومت کی راہ ہموار ہوتی‘ یہ تحریک راستے میں ہی ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ کیونکہ ان علاقوں میں شریعت کے نفاذ سے پہلے لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کے لیے زمین ہموار نہیں کی گئی تھی۔ بس یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ لوگ چونکہ مسلمان ہیں اس لیے احکامِ شریعت پر عمل پیرا ہوں گے اور ہمارا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب نفاذِ احکام کے دوران بیٹیوں کو شریعت کے مطابق حقوق اور حصہ دینے کی بات ہوئی تو مخالف ہو گئے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے تلاوتِ آیات کے بعد تزکیہ اور اس کے بعد احکامِ شرعی کو سیکھنے سکھانے کی جو ترتیب رکھی ہے‘ اس میں بہت بڑی حکمت ہے۔ چنانچہ اب نصابِ تعلیم و تربیت کو اسی ترتیب سے ہی اختیار کرنا ہوگا۔ تزکیہ نفس کے بغیر انسان اس کیفیت کا شکار رہتا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اس نصابِ تعلیم و تربیت کی نتیجہ خیزی اور تاثیر کے لیے قرآن حکیم کے مندرجہ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾﴾ (البقرة)

’’جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے‘ تمہارا تزکیہ کرتا ہے‘ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔‘‘

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾ (آل عمران:١٦٤)

’’اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا کہ جب انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے‘ انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔‘‘

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾ (الجمعة:٢)

’’وہی ہے جس نے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا جو انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے‘ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔‘‘

ان آیات پر دوبارہ غور کیجیے‘ ضمائر پر غور کیجیے۔ یہ بات واضح ہے کہ نبی رحمت ﷺ خود اپنے اصحاب کی تربیت فرماتے۔ آپ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب میں استاد اور شاگرد کا زندہ رابطہ موجود تھا۔ آپ ﷺ کی ذاتِ پاک خود ایمان و یقین کا منبع و سرچشمہ ہے۔ صرف ایک دفعہ آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والا بھی ایمان و یقین اور اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ بن جاتا۔ آپؐ کی مجلس میں ایمان و یقین کی کیفیات کس درجہ کی ہوتی تھیں‘ اس سے متعلق حضرت حنظلہ ؓ کا مشہور واقعہ ہے۔ حضرت حنظلہ اور حضرت ابوبکرؓ نے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں‘ آپؐ دوزخ اور جنت کے حالات ہم سے بیان کرتے ہیں تو گویا ہم یہ سب اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر جب ہم لوٹ کے جاتے ہیں‘ عورتوں اور مال میں مشغول ہو جاتے ہیں تو ہماری کیفیت بدل جاتی ہے۔ پس

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’اگر تم اپنے اس حال پر قائم رہو جس حال میں میرے پاس سے اٹھ کر جاتے ہو تو بے شک تمہاری مجلسوں میں‘ تمہارے راستوں میں اور تمہارے بستروں میں فرشتے تم سے مصافحہ کریں۔ لیکن اے حنظلہ! کوئی وقت کیسا ہوتا ہے اور کوئی وقت کیسا!‘‘

اس نصابِ تعلیم سے صحیح استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ والوں کی مجلس میں شریک ہوا جائے اور استاد اور شاگرد کے درمیان صحبت کا زندہ رابطہ موجود ہو۔ آج لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم خود قرآن مجید پڑھ لیتے ہیں‘ ٹی وی سے سن لیتے ہیں‘ انٹرنیٹ سے پڑھ لیتے ہیں‘ خط و کتابت کورس سے سیکھ لیتے ہیں‘ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پڑھ لیتے ہیں‘ دوسری سمعی و بصری سہولیات سے حاصل کر سکتے ہیں...... ٹھیک ہے‘ ان ذرائع سے معلومات کا ذخیرہ تو مل سکتا ہے‘ لیکن تربیت کا مقصد بالکل حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نصاب کے ثمرات کا حصول فیضانِ صحبت سے ہی ممکن ہیں۔ یہ نصابِ تعلیم حضرت ابرہیم علیہ السلام کا تجویز کردہ‘ اللہ تعالیٰ کا منظور کردہ اور نبی کریم ﷺ کا عمل فرمودہ ہے۔ اس لیے انسان کو انسان بنانے کا واحد اور کامیاب ذریعۂ تعلیم و تربیت یہی نصاب ہے۔ تعلیم کے بڑے بڑے ادارے اور ان کی ڈگریاں اور اسناد انسان کو انسان نہیں بنا سکتیں۔ یہ فنون کے ادارے ہیں‘ ان کا فارغ التحصیل صدرِ مملکت بن کر یا وزیر تعلیم بن کر بھی انسان نہیں بن سکتا۔ یہ لارڈ میکالے کا ترتیب دیا ہوا نظامِ تعلیم و تربیت ہے جس کے نتیجے میں زیادہ تر منہ کالے اور سیاہ باطن افراد ہی جنم لے سکتے ہیں‘ لوگ انجینئر‘ ڈاکٹر اور اکاؤنٹینٹ وغیرہ بن سکتے ہیں...... لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے یہ لوگ اچھے انسان بھی بنیں تو پھر ضروری ہے کہ ان اداروں میں بھی ابراہیمی نصابِ تعلیم و تربیت کو نافذ کیا جائے۔

✿✿✿

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۴)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

گیارھواں اصول:

﴿وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝﴾

’’اور جادوگر کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا۔‘‘

یہ قرآنِ حکیم کے مضبوط ترین اصولوں میں سے ایک اصول ہے‘ انتہائی ضروری ہے کہ اسے لوگوں کے سامنے لایا جائے‘ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ جادوگروں اور شعبدہ بازوں کے کام کا بازار گرم ہے۔ اس اصول کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان واضح کر رہا ہے:

﴿وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷﴾ (یونس)

’’امرِ واقعہ یہ ہے کہ جادوگر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔‘‘

فرعون کی طرف سے لائے گئے جادوگروں سے جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ ہوا‘ اور آپ نے اُن کو ایک خاص دن میں اکٹھے ہونے کا وعدہ دیا‘ اس موقع کی مناسبت سے یہ اصول سامنے آیا‘ جس کا ذکر سورۃ طٰہٰ میں ہے۔ پھر جب یہ لوگ اکٹھے ہوگئے تو کیا ہوا:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝۶۵ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝۶۶ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝۶۷ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝۶۸ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝۶۹﴾

’’کہنے لگے: اے موسیٰ! یا تو تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالنے والے بن جائیں! جواب دیا

کہ نہیں تم ہی پہلے ڈالو۔ اب تو موسیٰ (علیہ السلام) کو خیال گزرنے لگا کہ اِن کی رسیاں اور لکڑیاں اِن کے جادو کے زور سے دوڑ بھاگ رہی ہیں‘ تو موسیٰ نے اپنے دل ہی دل میں ڈر محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا: کچھ خوف نہ کر‘ یقیناً تو ہی غالب اور برتر رہے گا۔ اور تیرے دائیں ہاتھ میں جو ہے اُسے ڈال دے کہ ان کی ساری کاریگری کو نگل جائے۔ انہوں نے جو کچھ بنایا ہے یہ سب جادوگروں کے کرتب ہیں‘ اور جادوگر کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا۔‘‘

جادوگر سے کامیابی کی نفی کا معنی ہے کہ وہ کافر ہے۔ (اللہ محفوظ فرمائے!) دوسری بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے‘ فرمایا:

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ﴾

(البقرۃ:۱۰۲)

’’سلیمان (علیہ السلام) نے تو کفر نہ کیا تھا بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا‘ وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ﴾ ’’سلیمان نے تو کفر نہ کیا تھا‘‘ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ اگر (بفرضِ محال) سلیمان جادوگر ہوتا تو کافر ہوتا (اللہ کی پناہ!) اور فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ﴾ ’’بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا‘ وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے‘‘۔ یہ آیت کریمہ صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ جادو سکھانے والا کافر ہے۔

قرآنِ حکیم میں بہت ساری آیات جادو اور جادوگروں کے بارے میں آئی ہیں جن میں ان کی گمراہی اور دنیا و آخرت میں ان کے خسارے کی بات ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اہلِ ایمان کے لیے مقامِ تعجب ہے کہ اسلامی ملکوں میں پھر بھی جادو پھیل رہا ہے۔

تعجب اس بات پر نہیں کہ جادوگر زندہ ہیں‘ یہ تو کائنات کے سب سے زیادہ افضل زمانے میں بھی پائے جاتے تھے‘ دوسرے زمانوں کی تو بات ہی دوسری ہے۔ اور اس بات پر بھی کوئی حیرانی نہیں کہ جادوگر مال کمانے کے لیے کوئی بھی طریقہ استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن مقامِ تعجب یہ ہے کہ جو امت قرآنِ کریم کی تلاوت کرتی ہے اور اس میں ان واضح اور صریح آیات کی بھی تلاوت کرتی ہے جن میں جادو اور جادوگروں سے خبردار کیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کا دنیا و آخرت میں انجام بہت بھیانک ہے‘ اس کے باوجود لوگ قطار در قطار ان جادو ٹونہ کرنے

والوں کے دروازوں پر کھڑے ملیں گے یا ایسے ٹی وی چینلوں (channels) کو دیکھ رہے ہوں گے جن میں جادو اور شعبدے بازی دکھائی جا رہی ہوتی ہے۔ ایک زمانے سے انہی چینلوں نے اس کاروبار کو چمکایا ہوا ہے۔ یہ لوگ تلاش کرتے رہتے ہیں کہ کس طرح فلاں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے یا اس نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ گویا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا ہی نہیں ہے:

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ١٠٢﴾ (البقرة)

”اور دراصل وہ بغیر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ لوگ وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچائے اور نفع نہ پہنچا سکے‘ اور بالیقین جانتے ہیں کہ اس کے لینے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں۔ کاش کہ جانتے ہوتے!“

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اگر لوگ اس کثرت کے ساتھ جادُو ٹونہ کرنے والوں کے پاس نہ جائیں تو نہ اُن کے کاروبار کا بازار گرم ہو اور نہ ان کا یہ باطل پھیل سکے۔ اگر کسی انسان کو شدید بیماری گھیر لے یا کوئی دماغی مشکل آ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے لیے جادو ٹونہ کرنے والوں کے پاس جانا جائز ہو گیا ہے۔

ان لوگوں سے کسی فائدے کی کیا اُمید کی جا سکتی ہے جن کے بارے میں خود اُن کے رب نے خسارے اور گھاٹے کا فیصلہ لکھ دیا ہو؟ خود اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ رحمتوں والا اور حکمتوں والا ہے کہ (اگر کوئی فائدہ ہوتا تو اس کے باوجود) وہ ان کو جادوگروں کے پاس جانے سے روک دیتا۔ اور جس مصیبت کا وہ شکار ہو چکے ہیں اس کے لیے کوئی دوا نہ اتاری ہو‘ جبکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ ، فَاِذَا اُصِيْبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرِئَ بِاِذْنِ اللّٰهِ))

(صحیح مسلم‘ حدیث ۲۲۰۴، بروایت سیدنا جابر ؓ)

”ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ پس جب کوئی دوا بیماری کے موافق بیٹھ جاتی ہے تو اللہ کے اِذن سے شفا مل جاتی ہے۔“

صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ ؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً))

”اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نہیں اتاری جس سے شفا دلانے والی دوا نہ اُتاری ہو۔“

چونکہ جادو کے نقصانات بہت بڑے ہیں اسی لیے تمام شریعتوں میں جادو حرام ہے‘ اور جس شخص کو یقین ہو جائے کہ جادوگر جہاں سے مرضی آ جائے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا اور جسے یقین ہو جائے کہ جادوگر لوگ کامیاب نہیں ہوا کرتے‘ وہ درج ذیل کام ضرور کرے گا:

۱) وہ اس قسم کے لوگوں سے بہت دور رہے گا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں کامیابی کی نفی کی ہے‘ نہ تو علاج کی خاطر اُن کے پاس جائے گا اور نہ کسی اور مقصد کی خاطر۔

۲) جادو کی جملہ اقسام کو استعمال کرنے سے کوسوں دور رہے گا‘ خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں‘ نہ دوسروں کی محبت پانے اور نہ کسی کی محبت میں خلل ڈالنے کے لیے‘ جیسا کہ بہت ساری عورتوں کا شیوہ ہے۔ عورت کا خیال ہوتا ہے کہ اپنے خاوند کو اپنی طرف مائل کرنے یا خاوند کو دوسری شادی سے روکنے کی خاطر یا اسی طرح کے کسی دوسرے کام کی خاطر جادو ٹونے کا استعمال جائز ہے۔ واضح رہے یہ سب شیطان کی پٹی پڑھائی ہوئی ہے اور اسی نے اس کام کو خوبصورت نام دیے ہیں۔

۳) واضح رہنا چاہیے کہ جو کوئی جادو والے کام کرتا ہے یا اس کام میں مددگار بنتا ہے‘ وہ شدید خطرے میں ہے۔ اس نے اپنے دین کو چند کوڑیوں میں بیچ دیا ہے اور اس کام میں شیاطین ہی اس کے مرشد اور استاد ہیں۔

۴) اگر کسی لمحہ انسان کمزور پڑ جائے اور ایسے کبیرہ گناہ کو شیطان اس کے سامنے خوبصورت بنا کر پیش کرے (اور وہ یہ گناہ کر گزرے) تو اُسے فوراً توبہ کرنی چاہیے‘ اس باطل کام کو فوراً چھوڑ دے اور اس کام کی وجہ سے جس جس کو تکلیف پہنچی ہو اس سے معافی مانگے‘ اور یہ کام اس سے پہلے پہلے کر لے کہ اُس عظیم ذات کے سامنے حساب کے لیے کھڑا ہو جس سے کوئی چھوٹی بڑی بات چھپتی نہیں‘ جو ذات یہ بھی جانتی ہے کہ جادوگر کون ہے؟ کس پر جادو کیا گیا ہے؟ اور اس کام میں کس کس نے مدد کی ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ ظالم سے مظلوم کا بدلہ لے گا‘ اور یہ وہ وقت ہو گا جب ایک نیکی بھی ساری کائنات سے زیادہ عزیز ہو گی۔

جب مؤمن کو اس اصول پر پختہ یقین ہو جائے کہ ﴿وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ○﴾ ’’اور جادوگر کہیں سے بھی آئے‘ کامیاب نہیں ہوتا‘‘ تو اس کی توکّل والی عبادت مضبوط ہو جائے گی اور جادوگر جیسی نیچ اور بے کار قوم کے ڈر کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو یاد رکھے گا: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ (الزمر:۳۶) ’’کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟‘‘ اور دوسری قراءت کے اعتبار سے ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عِبَادَهٗ﴾ ’’کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے؟‘‘ جواب واضح ہے: ’’قسم بخدا‘ ایسا ہی ہے۔‘‘

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے بھلے یہ جادوگر بے حساب مال و دولت کے مالک ہوں‘ اور لوگوں کی ان کی طرف والہانہ توجہ کی وجہ سے ایک نشے کے عالم میں جیتے ہوں‘ پھر بھی وہ سب سے زیادہ بدبختی کی زندگی جیتے ہیں اور ان کی روحیں انتہائی خبیث اور ناپاک ہوتی ہیں‘ اور اس بات پر کسی حیرانی کی ضرورت نہیں۔ جس شخص نے شیطانوں کو اپنا لیڈر مان لیا ہو اور ربّ العالمین کا انکار کرتا ہو وہ کس طرح خوش بخت ہو سکتا ہے یا کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے؟

بارھواں اصول

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ﴾

’’یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔‘‘

قرآنِ کریم کے محکم ترین اصولوں میں سے ایک یہ اصول ہے‘ جو اِس دین کی عظمت بیان کر رہا ہے‘ اس کی بلندی کا امین اور اس کے اصولوں کا پاسبان ہے۔ یہ آیتِ کریمہ سورۃ الحجرات میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سارے اخلاقِ فاضلہ اور اچھی خصلتوں کے ذکر کے بعد اس آیت کو ذکر فرمایا ہے‘ اور برے اخلاق اور گھٹیا عادتوں سے روکنے کے بعد اس بات کو بیان کیا ہے۔ اِس آیت میں اس جامع اصول کو بیان فرمایا ہے جس سے تمام اچھے اخلاق جنم لیتے ہیں اور تمام غلط اخلاق کا راستہ بند ہوتا ہے یا وہ بہت کمزور ہو جاتا ہے‘ اور یہی آیت اللہ تعالیٰ کے ہاں باہمی فضیلت یا عزت کا معیار ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ⑬﴾ (الحجرات)

’’اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے کنبے اور قبیلے بنا دیے ہیں تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ دانا اور باخبر ہے۔‘‘

یقیناً یہ بڑی عظیم آیت ہے جو عدل وانصاف کو واضح کر رہی ہے جو اس دین کے علاوہ کسی دوسرے دین میں واضح نہیں ہوئے۔

اس آیتِ کریمہ کی اہمیت آپ کے سامنے اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک آپ اپنے ذہن میں ان حالات کو تازہ نہ کر لیں جن سے عرب معاشرہ گزر رہا تھا کہ وہ کس طرح سے دوسرے قبائل سے معاملہ کیا کرتے تھے‘ خواہ ان کا تعلق ایسے قبائل کے ساتھ تھا جن کو وہ نسب کے اعتبار سے نیچ قبیلے مانتے تھے‘ یا ان کا تعلق غیر عرب قبائل کے ساتھ تھا‘ یا ان کا تعلق غلاموں یا آزاد شدہ قبائل کے ساتھ تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ صحابہ کرام ؓ کی تربیت اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں کریں اور آپ ﷺ نے زبانی اور عملی طور پر بار بار اس آیت پر عمل کیا۔ میں یہاں صرف دو مثالیں پیش کر رہا ہوں جن کو قیامت تک نہ تو عرب بھلا سکیں گے اور نہ ہی قریش۔

پہلا واقعہ: یہ فتح مکہ کا دن ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا بلال ؓ کو حکم دیا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاؤ اور بلند آواز سے اذان دو۔ جو لوگ وہاں پر موجود تھے ان میں سے کافر قریشیوں کی بات تو چھوڑیے‘ جدید مسلمانوں کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے اس قسم کا منظر دیکھیں گے کہ ایک حبشی غلام اس مقام پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن یہ اسلام اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کا اعجاز تھا جو زبانی اور عملی دونوں طرح سے لوگوں کی تربیت کر رہا تھا۔ اور یہ فتح مکہ ہی کے دن کی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ خانہ کعبہ کے اندر تشریف لے جاتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں وہ کون کون سی شخصیات ہو سکتی ہیں جو آپ ﷺ کے ہمراہ داخل ہونے کا شرف پا سکی ہوں گی؟ اور جن لوگوں کو آپؐ ہمراہ لے کر گئے تھے اُن کے داخل ہوتے ہی آپؐ نے خانہ کعبہ کا دروازہ بند کر دیا! آپ ﷺ کے ہمراہ صرف تین آدمی داخل ہوئے:

(۱) اُسامہ بن زید (جو خود بھی آپ ﷺ کے غلام اور ان کا باپ بھی آپ ﷺ کا غلام)

(۲) بلال حبشی

(۳) عثمان ابن طلحہ جو خانہ کعبہ کے کلید بردار (چابی کے ذمہ دار) تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

جاہلیت کے معیارات کو ملیامیٹ کرنے کے لیے اس سے بڑی کون سی عملی دلیل ہوسکتی ہے؟ حالانکہ حاضرین میں سیدنا بلال وسیدنا اُسامہ ؓ سے افضل لوگ بھی موجود تھے‘ جیسے چاروں خلفاءِ راشدین اور باقی حضراتِ عشرہ مبشرہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

دوسرا واقعہ: یہ واقعہ اس دن پیش آیا جو اس وقت کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا واقعہ تھا‘ یعنی حجۃ الوداع کا اجتماع۔ اس اجتماع کے موقع پر لوگ وہاں سے کوچ کی تیاری کر رہے تھے اور لوگوں کی نگاہیں اس جانور پر لگی ہوئی تھیں جس پر نبی اکرم ﷺ کو سوار ہونا تھا کہ آج وہ کون خوش قسمت ہے جسے آپ ﷺ کے پیچھے اس جانور پر سوار ہونے کا موقع ملے گا! کیا دیکھتے ہیں کہ وہ کالا کلوٹا نوجوان جو آپ ﷺ کا غلام ہے اور اس کا والد بھی آپ کا غلام تھا وہ آپ ﷺ کے پیچھے سوار ہوا اور لوگ یہ منظر اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ یہ کام اُس نبی ﷺ نے عملاً کر کے دکھایا جس نے اسی دن وہ عظیم خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں توحید اور اسلام کے بنیادی اصول بیان کیے تھے نیز شرک اور جاہلیت کے اصولوں کو پاش پاش کیا تھا اور وہ مشہور قول ارشاد فرمایا تھا: ’’یقیناً جاہلیت کی ہر بات آج میرے قدموں کے درمیان رکھی ہوئی ہے‘‘۔ یہ دو واقعات آپ ﷺ کی گلبہار سیرت میں سے ایسے ہی ہیں جیسے سمندر کے دو قطرے ہوں۔

اس دین کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کے مقام و مرتبے کو کسی ایسی چیز سے منسلک نہیں کیا جو اس کے اپنے اختیار میں نہ ہو۔ چنانچہ انسان کے اپنے بس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے بڑے خاندان کا انتخاب کرے‘ ورنہ ہر آدمی کی خواہش ہوتی کہ اس کا تعلق خاندانِ نبوت سے ہو۔ نہ کسی کے لمبے قد یا چھوٹے قد یا خوبصورت یا بدصورت ہونے سے اس کے مقام کا تعلق ہے اور نہ کسی دوسری چیز سے مقام و مرتبے کا تعلق ہے جو انسان کے بس میں نہیں۔ بلکہ انسان کے مقام و مرتبے کا اُس معیار سے تعلق ہے جو اُس کے بس میں ہے۔ اسی لیے قرآنِ حکیم میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی کی تعریف اس کے نسب کے حوالے سے کی گئی ہو اور نہ ہی کسی مذمت اس کے نسب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مدح کا معیار ایمان وتقویٰ ہے اور مذمت کا معیار کفر‘ فسق اور نافرمانی ہے۔

اس بات کی گواہی کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پوری سورت ابولہب کی مذمت میں نازل فرمائی کہ اس کا کفر اور نبی اکرم ﷺ سے اس کی دشمنی بہت واضح تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اس بات سے منع فرمایا کہ دنیوی طور پر اپنے کمزور صحابہؓ کو اپنے سے دور کریں‘ اگرچہ آپ ﷺ کا مقصد سردارانِ قریش کے دلوں کو اپنے قریب کرنا تھا۔

فی زمانہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ انتہائی قابلِ افسوس ہے‘ جس کی ایسی بہت ساری مثالیں پائی جاتی ہیں جو اس شرعی قاعدے کے سخت خلاف ہیں: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ﴾ ’’بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے‘‘ جو کہ جاہلانہ قبائلی عصبیت کی شکل میں نظر آ رہا ہے‘ کہ صرف قبیلے کے افراد کے درمیان باہمی پہچان ہی نہیں رہ گیا اور نہ ہی قابلِ قبول مدح تک محدود رہ گیا ہے‘ بلکہ مدح میں بھی غلو کی حدوں کو پار کر گیا ہے۔ اور لوگ قبیلے کا ساتھ دینے میں بھی قبیلہ پرستی کا شکار ہیں‘ بلکہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دوسرے قبیلے والوں یا دوسرے شہر والوں کی مذمت کی باتیں ہوتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر شرعی معیارات بالکل بکھر کر رہ گئے ہیں۔ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو سنتا ہے: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ ’’اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے‘‘ اسے قابلِ مذمت باہمی فخر کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیے۔ مؤمن کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ’’جس کو اس کا عمل سست کر دے اس کا نسب اس کو تیز نہیں کر سکتا‘‘۔

(جاری ہے)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے   اشاعت عام: 30 روپے

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جامعیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان اللہ تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے۔ یہ مکلّف ہے اور اسے نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ بھلائی کی طرف جائے یا بدی کی طرف۔ اُسے بتا دیا گیا ہے کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے' اگرچہ اس نے انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کا شعور رکھ دیا ہے' تاہم اُس نے گاہے گاہے انسانوں میں پیغمبر بھیجے جو انہیں صحیح اور غلط کی نشان دہی کرتے رہے۔ اچھے کاموں کا اچھا انجام اور برے کاموں کا برا انجام واضح کرتے رہے۔ پیغمبروں کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام تک چلتا رہا۔ پھر اس سلسلہ کے آخر میں ختم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اُن پر قرآن کریم کا نزول ہوا جو ساری الہامی کتب کا مہیمن (نگران) ہے اور قیامت تک انسانوں کے لیے مکمل ضابطہ حیات اور آخرت کی فلاح کا موجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا' بالفاظِ قرآنی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''۔ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو پسند کرتا ہے جو قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے عین منشائے خداوندی کے مطابق قرآن کی متابعت میں زندگی گزاری۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے۔ ایک صاحب نے آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے آپؐ کے معمولات کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپؐ کی زندگی تو بس قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھی۔ گویا قرآن تھیوری ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ پریکٹیکل۔ چونکہ آپؐ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے مثالی زندگی تھی' لہٰذا جب ہم آپؐ کے شب و روز کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایسی بھرپور زندگی گزاری ہے کہ ہر فردِ بشر کے لیے آپؐ کی زندگی اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ یعنی ہر انسان اپنے مخصوص حالات میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے نمونہ حاصل کرسکتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ کی زندگی میں اعلیٰ درجے کی

جامعیت تھی۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں جن حالات میں ہوں یہ حالات حضور ﷺ کو پیش نہ آئے اور اس معاملے میں آپؐ کی زندگی سے راہ نمائی نہیں ملتی۔

انسانی زندگی میں خوشی' غمی' حادثات' بیماریاں اور صدمات ناگزیر ہیں' ہر انسان کو ان حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی یہ سارے مرحلے آئے اور ان مراحل میں سے گزرنے کا انداز نبوی زندگی میں موجود ہے۔ جن کاموں کو معاشرے میں گھٹیا سمجھا جاتا ہے' رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کر کے انسانیت کے اُس طبقے کے لیے مثال قائم کردی تاکہ کوئی بھیڑ بکریاں چرانے والا یا مزدور' موچی اپنے آپ کو کم تر نہ سمجھے اور نہ ہی معاشرے میں اُسے نیچ سمجھا جائے۔ آپ ﷺ نے لڑکپن میں بکریاں بھی چرائیں۔ گھر کے کام خود کیے۔ اپنے جوتوں کو مرمت بھی کیا۔ بلکہ دوسرے ضرورت مندوں کے بھی کام کیے۔

آپ ﷺ نے ناداری کا زمانہ بھی دیکھا اور بڑے صبر و ثبات کے ساتھ وقت گزارا۔ کبھی آپؐ کے ہاں کھانا پکتا اور کبھی فاقہ ہوتا۔ ہر تنگ دست کے لیے ناداری شکوے اور شکایت کا باعث نہیں کہ یہ صورت حال آپ ﷺ پر بھی آئی اور ان حالات میں آپؐ کا اندازِ حیات نادار لوگوں کے لیے احساس کمتری نہیں بلکہ راضی برضائے ربّ کا مظہر ہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپ ﷺ کے پاس مالِ غنیمت کے ڈھیر لگ گئے۔ ایسے وقت میں آپؐ کے گھر والوں نے گھریلو اخراجات کے لیے پیسے مانگ لیے مگر آپؐ نے فقر و فاقہ کو تونگری پر ترجیح دی اور اپنے اہل بیت کو صبر کی تلقین کر کے مطمئن کر دیا۔ اگر کبھی سفر درپیش ہوتا' سواریاں کم ہوتیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باری باری سواریوں سے فائدہ اٹھاتے۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ کو یہ گوارا نہ تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ اُن کے ساتھ پیدل چلیں' مگر آپؐ کسی امتیاز کو پسند نہ کرتے اور اپنی باری پر سواری پر بیٹھتے اور دوسروں کے ساتھ پیدل بھی چلتے جبکہ بعض صحابہؓ سواریوں پر ہوتے۔ سفر کے دوران کہیں پڑاؤ کرتے۔ کھانے پکانے کی نوبت آتی تو آپؐ دوسروں کے ساتھ مساوی کام کرتے۔ کبھی چولہا جلانے میں مدد دیتے اور کبھی آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتے۔ آپؐ کی زندگی میں اجتماعی خوشی کے مواقع بھی آئے۔ غزوہ بدر میں کامیابی بہت بڑی خوشی تھی جس میں مٹھی بھر مسلمانوں نے کفار کے کیل کانٹے سے لیس بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہوئے' مگر اس موقع پر آپ ﷺ نے کسی جشن کا اہتمام نہ کیا۔ اسی طرح کتنی ہی جنگوں میں کفار کے ساتھ آپؐ کا مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ فتح مکہ وہ موقع تھا کہ آپ ﷺ جانی دشمنوں کی موجودگی میں اُس شہر میں داخل ہو رہے تھے' جہاں آپؐ کا رہنا

محال کر دیا گیا تھا اور آپؐ کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی عاجزی اور انکساری کی مثال قائم کر دی اور بڑی وسعت قلبی کے ساتھ بدترین دشمنوں کو معاف کر دیا۔ گویا فتح یاب ہونے والے مسلمان حکمرانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ شکست کھا جانے والوں کے حق میں نرمی کا رویہ اختیار کریں اور کسی طرح کی انتقامی کارروائی نہ کریں۔

جنگ خندق کے موقع پر مدینہ شہر کے اطراف میں خندق کھودنے کا فیصلہ ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھدائی کرنے کے لیے جتنی جتنی زمین دی گئی آپؐ نے بھی بنفس نفیس اتنی زمین کی کھدائی کی‘ بلکہ دوسروں سے بڑھ کر کام کیا۔ اس موقع پر ایک صحابی نے بھوک کی شدت کا اظہار کیا اور پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اُس نے پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا ہے تاکہ جسم کا توازن برقرار رہ سکے۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا تو وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ گویا آپ ﷺ کے اُسوہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ کی رضا میں کام کرتے ہوئے اگر مشکلات آئیں تو اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے‘ بددل ہو کر ہمت نہیں ہارنی۔

مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کی گئی۔ دشمنوں نے آپؐ کو زخمی کیا‘ بُرا بھلا کہا۔ آپؐ کو ہر ممکن طریقے سے ستایا اور مطالبہ کیا کہ آپؐ اسلام پھیلانے سے باز رہیں‘ مگر آپؐ کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ نہ ہی آپؐ نے گالی کا جواب گالی سے دیا اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنا مشن چھوڑا۔ گویا حق کی حمایت کرنے والوں کو سبق دیا کہ وہ کسی طرح کی مخالفت سے دل برداشتہ نہ ہوں‘ بلکہ پوری ہمت اور کوشش کے ساتھ ناموافق حالات کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کریں اور بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ کفار کو دین اسلام کی طرف بلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ گویا دین کی سربلندی میں جدوجہد کرنے والے پوری پامردی کے ساتھ حق کی حمایت جاری رکھیں۔

کفارِ مکہ نے آپ ﷺ کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا اور آپؐ کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ آپؐ کے ساتھ چند صحابہؓ بھی تھے اور کچھ آپؐ کے خاندان کے لوگ بھی تھے جو ابھی اسلام نہ لائے تھے۔ یہ بڑا کڑا وقت تھا۔ کھانے پینے اور استعمال کی کوئی چیز آپ ﷺ تک نہ پہنچ پاتی۔ چھوٹے بچے بھوک سے بلبلاتے رہے مگر ظالموں کو رحم نہ آتا۔ آخر اس مقاطعے کی تحریر کو کیڑا کھا گیا اور مقاطعہ ختم ہو گیا۔ اس میں اُن بے گناہ قیدیوں کے لیے اطمینان کا سامان ہے کہ جس طرح وہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں اس طرح اللہ کے آخری رسول ﷺ کو بھی قید میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سمیت اس اذیت ناک صورت حال کو

بڑی پامردی کے ساتھ برداشت کیا اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کیا۔

اللہ کے رسول ﷺ تبلیغی سفر پر طائف پہنچے جہاں آپؐ کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا گیا۔ آپؐ کی بات نہ سنی گئی‘ بلکہ آبادی کے غنڈوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا گیا‘ جنہوں نے تاک تاک کر آپؐ کے ٹخنوں اور پاؤں پر پتھر مارے۔ آپ ﷺ کے پاؤں لہولہان ہو گئے اور اس اذیت سے آپؐ زمین پر گر گئے۔ یہی وہ موقعہ تھا کہ ملک الجبال نے آپؐ سے اجازت مانگی کہ آپؐ کہیں تو اس وادی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالا جائے‘ مگر آپؐ نے اجازت نہ دی‘ بلکہ فرمایا کہ یہ لوگ نہیں تو ان کی اولاد سے توقع ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ حق کی نشر و اشاعت کے نتیجے میں مخالفت ہو گی‘ مشکلات آئیں گی‘ اذیتیں دی جائیں گی‘ مگر اُسوۂ حسنہ یہ ہے کہ صبر و سکون اختیار کیا جائے اور دشمنوں کے حق میں بددعا بھی نہ کی جائے۔

اپنے ذاتی کاموں کے لیے خادم رکھنے کی اجازت ہے‘ مگر خادم کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا سلوک کرنے کی ہدایت ہے۔ آپ ﷺ خادم سے وہ کام کرواتے جو اگر خود کو کرنا پڑے تو اس میں عار محسوس نہ ہو۔ نیز آپؐ خادم کو وہی کھلاتے جو خود کھاتے اور وہی پہناتے جو خود پہنتے۔ خادم سے ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں کو بڑی فراخ دلی سے برداشت کر لیتے اور خادم کو برا بھلا نہ کہتے۔ کسی نے پوچھا کہ خادم کو کہاں تک معاف کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ستر بار۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپؐ کے خادمِ خاص تھے۔ ابھی لڑکپن میں تھے۔ آپؐ نے کسی کام کے لیے انہیں گھر سے باہر بھیجا تو وہ دیر تک واپس نہ آئے۔ آپؐ انتظار کرتے رہے‘ بالآخر آپؐ خود ان کے پیچھے چلے۔ دیکھا تو وہ راستے میں ایک کھیل تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے۔ آپؐ نے انہیں نہ جھڑکا‘ نہ برا بھلا کہا۔ حضرت انس کہتے ہیں میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت کی مگر آپؐ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا؟ آپ ﷺ کا اپنے خادم زیدؓ کے ساتھ حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ زید کے والد اور چچا آپؐ کے پاس آئے اور زید کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے فرمایا یہ زید ہے‘ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو لے جاؤ اور اگر یہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں اسے تمہارے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔ چنانچہ زید نے آپ ﷺ کے حسن سلوک کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کیا اور اُن کے والدین کو خالی ہاتھ جانا پڑا۔ یہ وہ سلوک ہے جو آپؐ کی تعلیم ہے کہ خادموں اور نوکروں کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے گیارہ نکاح کیے اور اپنی تمام بیویوں کے ساتھ یکساں حسن سلوک کے

ساتھ رہے۔ کسی بیوی کو آپؐ سے کسی طرح کی شکایت نہ تھی۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہے‘ اور دیکھو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والا ہوں۔ اسی حسن سلوک کو آپؐ پسند کرتے تھے کہ دوسرے مرد بھی اختیار کریں۔ ایک مسلمان مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایک وقت میں نو بیویاں تھیں۔ آپؐ نے نو کے درمیان عدل کر کے دکھا دیا۔ پس جو مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہو اس کے لیے آپؐ کی زندگی سے راہنمائی مل سکتی ہے۔

شادی کا موقع گھر میں خوشی کا وقت ہوتا ہے‘ اس وقت آپ ﷺ نے بچیوں کو خوشی کے گیت گانے کی اجازت دی‘ البتہ وہ گانے ممنوع قرار دیے جو تہذیب و اخلاق سے ہٹ کر ہوں۔ ہاں ایسے اشعار پڑھے جائیں جن میں قومی بہادروں کے کارناموں کا ذکر ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں‘ جو سادگی کا نمونہ تھیں۔ جہیز اور بارات کا کوئی سوال نہ تھا۔ شادی کے موقع پر صرف لڑکے والوں کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کے انعقاد کی اجازت ہی نہیں حکم ہے‘ تاکہ لڑکے والے اپنی خوشی میں عزیز و اقارب اور دوست احباب کو شامل کر کے اپنی خوشی کو دوبالا کر سکیں۔ ایسے موقعہ پر کسی قسم کی رسومات اور فضول چیزیں نہ تھیں۔ نہ لڑکی والوں کے گھر دعوت کا اہتمام تھا۔ بیٹی کی شادی ماں باپ پر کسی طرح کا بوجھ نہ تھی۔ آج بھی مسنون سادگی اپنا کر بیٹیوں کی شادیاں ہر طرح کے بار کے بغیر کرنا مسنون ہے۔ شادی کے موقع پر آپ ﷺ کے ہاں کسی طرح کی نمائش و نمود نہ تھی‘ نہ فضول روشنیاں تھیں‘ نہ دعوت کے اہتمام کے لیے گلیاں بازار بند کیے جاتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے ہاں انتہا پسندی کا کوئی سوال نہ تھا۔ ہر کام میں آپؐ اعتدال کی روش پسند کرتے تھے‘ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی آپؐ نے غلو کی اجازت نہ دی۔ جب آپؐ کو پتا چلا کہ ایک صحابی نے رات بھر جاگ کر نفل نمازیں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے‘ دوسرے نے لگاتار روزے رکھنے کا ارادہ کیا ہے‘ ایک نے کہا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا تاکہ خاندانی زندگی سے دور رہ کر بس نیک کاموں میں لگا رہوں تو آپ ﷺ نے ان تینوں کو تنبیہ فرمائی اور بتایا کہ میرا طریقہ دیکھو‘ رات کو سوتا بھی ہوں اور جاگ کر نماز بھی پڑھتا ہوں۔ لگاتار نفلی روزے نہیں رکھتا‘ بلکہ کبھی رکھتا ہوں کبھی چھوڑتا ہوں۔ میرے بیوی بچے ہیں‘ ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔

ایسا بچہ جو یتیم رہ گیا ہو‘ اُس کے ماں باپ وفات پا چکے ہوں‘ اُس کے لیے بھی آپؐ کی

زندگی میں مثال موجود ہے کہ وہ بد دل نہ ہو اور اللہ کے فیصلے پر ناخوش نہ ہو بلکہ تسلی رکھے کہ رسول اللہ ﷺ پر یہ مشکل وقت آیا تھا جو آپؐ نے صبر کے ساتھ گزارا۔

ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ کبھی بیمار ہی نہ ہوئے ہوں۔ جب آپؐ بیمار ہوتے تو دعائیہ کلمات پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے اور وہ ہاتھ تمام جسم پر پھیر لیتے۔ بیماری کی دوا لینے سے بھی آپؐ نے نہیں روکا بلکہ دوا لینے کی حوصلہ افزائی کی۔ آپؐ نے بیماروں کی تیمارداری کی۔ تیمارداری کو اجر و ثواب کا باعث بتایا۔ آپؐ بیمار کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ یہ بیماری تمہارے گناہ مٹا دے گی۔ جہاں بیمار کے لیے آپؐ کی زندگی میں اُسوہ حسنہ ہے وہاں تیمارداری کو بھی اعلیٰ درجے کا نیک عمل قرار دیا گیا ہے۔ تیمارداری کرنے والے کے لیے فرشتے رحمت و مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اگر کسی کا بچہ فوت ہو جائے تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اُسے صبر و سکون کا نمونہ ملے گا۔ آپؐ کے بیٹے چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئے اور آپؐ کو غم زدہ کر گئے۔ آپؐ کی تین شادی شدہ بیٹیاں آپؐ کے سامنے فوت ہو گئیں۔ آپؐ نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ نہ آپؐ روئے پیٹے اور نہ جزع فزع کی‘ بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور فیصلہ گردانا۔ ایک دکھ آپ ﷺ کو یہ ہوا کہ آپؐ کی دو بیٹیاں‘ ابولہب کے بیٹوں کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے اعلان نبوت کیا تو آپؐ کا چچا ابولہب آپؐ کا شدید دشمن ہو گیا (اس کی مذمت میں سورۃ اللھب نازل ہوئی۔) اُس کے بیٹوں نے آپؐ کی بیٹیوں کو طلاقیں دی دیں۔ بیٹیوں کی طلاق کا یہ صدمہ آپؐ کو برداشت کرنا پڑا۔ آج جس کی بیٹی طلاق یافتہ ہو جائے تو وہ کس قدر غم زدہ ہوتا ہے۔ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے دکھ کو دیکھے گا تو اُس کا غم ہلکا ہو جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

جنگ اُحد میں جب فتح شکست میں بدل گئی تو دشمن نے زوردار حملہ کیا۔ اس موقع پر آپؐ کے دانت شہید ہو گئے اور آپؐ زمین پر گر گئے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں جو بھی تکلیفیں آئیں وہ ایسی ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی زخم کھائے اور دشمن کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بنے۔ گویا حق کی حمایت میں ایسے مواقع آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

جہاں آپ ﷺ نے مدنی زندگی کے دوران جنگوں میں کامیابیاں حاصل کیں وہاں ہزیمت کا بھی نشانہ بنے۔ نہ آپؐ نے ان خوشیوں پر شادیانے بجائے اور نہ ناکامیوں پر بددل ہوئے‘ بلکہ اللہ کے فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کیا اور اُمت کے لیے اُسوۂ حسنہ چھوڑ گئے کہ زندگی میں فتح اور شکست ساتھ ساتھ ہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ کسی شخص کو زندگی میں کبھی ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ حق کا ساتھ دینے میں کبھی سستی کا مظاہرہ نہ کرے‘

بلکہ ناکامیوں سے سبق سیکھے اور کامیابیوں کی توقع رکھے۔

بشری تقاضے کے تحت آپ ﷺ پر ہر وہ صورت پیش آئی جو کسی دوسرے انسان پر گزری۔ ایک دفعہ آپؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک بچھو نے آپؐ کو کاٹ لیا۔ آپؐ نے درد محسوس کی اور فرمایا اللہ کی لعنت ہو بچھو پر کہ نہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ بے نمازی کو۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر اسے حرم میں پاؤ تو بھی اسے قتل کر دو۔

وفات کسی اپنے کی ہو یا پرائے کی آپؐ حکم خالق سمجھ کر صبر کے ساتھ برداشت کرتے۔ کسی عزیز کی وفات ہوتی تو آپؐ آبدیدہ ہو جاتے۔ اس صدمے کو اللہ کی رضا سمجھتے اور متعلقین کو صبر کرنے کو کہتے۔ آپؐ کی بیٹی حضرت زینب ؓ کا بچہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ آپؐ کی گود میں دے دیا گیا۔ اُس کا حال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپؐ تو میت پر گریہ وزاری سے منع کرتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا یہ رحمت کے اس جذبے کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر رحم کرتا ہے جن کے دلوں میں رحم کا جذبہ آتا ہے۔ جو شخص فوت ہو جاتا اُس کو پورے احترام کے ساتھ قبر میں اتار دیا جاتا۔ قبر کو زیادہ اونچا نہ کیا جاتا اور نہ اُس پر پھول چڑھائے جاتے۔ قبر پختہ نہ بناتے اور نہ ہی چونا گچ کے ساتھ اُسے مضبوط کرتے۔ اُس وقت یا بعد میں کسی وقت کوئی رسم ادا نہ کی جاتی بلکہ فوت شدہ کے لیے پورے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ بخشش کی دعائیں کی جاتیں۔ جس طرح دنیا میں حلال جانور بھی ہیں اور حرام بھی‘ حلال جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے اور حرام جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے‘ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کئی علوم پیدا کیے ہیں‘ اُن میں بعض کا حاصل کرنا جائز ہے اور بعض سے اجتناب ضروری ہے۔ ان ممنوع علوم میں جادو‘ کہانت‘ دست شناسی اور نجوم وغیرہ ہیں۔ اگرچہ ان علوم میں تاثیر بھی ہے۔

آپ ﷺ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں‘ ایک بحیثیت رسول اور ایک بطور انسان۔ چنانچہ آپ ﷺ پر جو بھی تکلیفیں آئیں ان سے آپؐ کا بشری وجود متاثر ہوتا۔ آپؐ پر یہودیوں نے کئی مخالف ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ایک دفعہ آپؐ پر جادو کیا گیا جس نے آپؐ کو جسمانی طور پر متاثر کیا۔ کوئی کام کر چکے ہوتے تو خیال ہوتا کہ نہیں کیا اور ایک کام نہ کیا ہوتا تو خیال ہوتا کہ کر لیا ہے۔ چند دن تک یہ اثر رہا‘ پھر اُس کے تدارک کے لیے معوذتین کا نزول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی راہنمائی کی اور اس جادو کا اثر آپؐ سے زائل ہو گیا۔ جادو کا یہ اثر آپؐ پر رہا مگر کسی طور پر آپؐ کی نبوی زندگی اس سے متاثر نہ ہوئی۔

آپ ﷺ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں کی طرف سے آپؐ کو از حد تکلیفیں پہنچیں۔ آپؐ کو تنگ کیا گیا‘ کئی طریقوں سے ستایا گیا‘ راستے میں کانٹے بچھائے گئے‘ طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ ابولہب کا مکان آپؐ کے گھر کے ساتھ تھا‘ وہ اور اُس کی بیوی آپؐ کے ہمہ وقت دشمن تھے‘ مگر آپؐ نے کبھی کوئی انتقامی کارروائی نہ کی بلکہ اُن کی بدسلوکی کا جواب خوش اخلاقی سے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کے وقت دوسروں سے قرض بھی لیا۔ یوں اگر کسی شخص کو ناگزیر ضرورت کے لیے قرض لینا پڑ جائے تو اُسوۂ حسنہ میں اس کی بھی گنجائش ہے۔

آپ ﷺ کی شخصیت میں انتہا درجے کی جامعیت ہے اور ہر شخص کے لیے آپؐ کی زندگی اُسوۂ حسنہ ہے۔ ایک عام انسان کو حیاتِ دُنیوی میں جس قسم کے حالات سے سابقہ پڑے‘ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں وہ نمونہ پائے گا۔ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ آپؐ کی زندگی کے حالات کو محفوظ بنا دے۔ لیکن آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی یہ حفاظت قرآنی الفاظ کی طرح نہیں ہوگی جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر) بلکہ اُسوۂ حسنہ کی حفاظت انسانی ہاتھوں کے ذریعے کی گئی۔ آج آپؐ کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا واقعہ بھی کتابوں میں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ کام انسانوں نے کیا لہٰذا کچھ برے لوگوں نے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی مگر وہ خدائی فیصلے کو بدل نہ سکے۔ جن لوگوں نے آپؐ کی احادیث میں جعل سازی کو داخل کرنا چاہا اللہ تعالیٰ نے ان کی غلط کارروائیوں کی قلعی کھول دی اور راسخ العلم متقی لوگوں نے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا اور آج رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھرپور انداز اور خالص حالت میں انسانوں کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ واقعی آپؐ بنی نوع انسان کے لیے مثالی انسان تھے۔ آپؐ کی زندگی میں غریب‘ امیر‘ سوگوار‘ مظلوم‘ مسافر‘ یتیم‘ بیمار‘ فاتح‘ مفتوح‘ خاوند‘ باپ‘ سپہ سالار‘ سربراہ مملکت‘ مزدور‘ چرواہے‘ جادو زدہ‘ بھوکے پیاسے‘ مصیبت زدہ غرض ہر شخص کے لیے نمونہ اور اطمینان و تسلی کا سامان موجود ہے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ جن کڑے حالات کا مجھے سامنا ہے حضور ﷺ ان سے نہیں گزرے‘ بلکہ قیامت تک کے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مشکل حالات میں رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے راہ نمائی لیں اور راضی برضائے ربّ کے جذبے کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

❁❁❁

حافظ‘ قرآن کیوں بھول جاتے ہیں؟

ڈاکٹر حافظ ظفر احمد ☆

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خوبصورت دماغ سے نوازا ہے اور اس دماغ کی خوبصورتی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب کوئی شخص قرآن پاک حفظ کر کے اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتا ہے۔ گویا حافظ قرآن کو ایک انتہائی خوبصورت ساتھی مل جاتا ہے جو چلتے پھرتے‘ اٹھتے بیٹھتے‘ بیماری میں‘ صحت میں‘ سفر وحضر میں اس کے ساتھ ہوتا ہے اور حافظ قرآن جب چاہے قرآن کو پڑھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی حافظ قرآن کے لیے الگ اجر رکھا ہے اور اس کے والدین کے لیے الگ۔ یہاں تک کہ ایک حافظ قرآن ان دس لوگوں کو جنت میں لے جائے گا جن کے لیے دوزخ لکھی جا چکی ہوگی اور اس کے والدین کو نورانی تاج پہنایا جائے گا۔

قرآن مجید کو حفظ کرنا ایک انتہائی محنت طلب کام ہے۔ فجر کی نماز کے بعد پڑھائی‘ ظہر کی نماز کے بعد پڑھائی اور پھر مغرب کی نماز کے بعد پڑھائی کوئی آسان کام نہیں‘ لیکن اس مرحلے سے ایک حافظ کئی سال تک گزرتا ہے۔ اس کا اجر اس کو یہ ملتا ہے کہ قرآن پاک اس کے سینے میں محفوظ ہو جاتا ہے اور حافظ کو نہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں بلکہ معاشرے میں بھی ایک اعلیٰ اور منفرد مقام مل جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو حافظ قرآن کو کسی بھی کالج یا یونیورسٹی میں داخلے کے وقت بیس اضافی نمبر بھی مل جاتے ہیں۔

میں ہیلی کالج آف کامرس میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں اور میرے ذمہ یہ کام بھی ہے کہ میں حفاظ کرام کا ٹیسٹ بھی لیتا ہوں۔ پچھلے پندرہ سال کے دوران میں نے اسّی کے قریب بچوں کا ٹیسٹ لیا‘ جن میں سے بمشکل پندرہ کامیاب قرار پائے۔ یہ کوئی ۱۸ فیصد بنتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سو حفاظ کرام میں سے ۱۸ کو قرآن پاک یاد ہوتا ہے‘ باقی ۸۲ کو بھول چکا ہوتا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ یہ سارے حافظ ہوتے ہیں۔ ان کے لب ولہجے اور تلفظ سے یہ غالب گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے حفظ کیا ہوا ہے۔ ان سب نے سخت محنت کی ہوتی ہے‘ لیکن کسی بھی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر ہیلی کالج آف کامرس‘ پنجاب یونیورسٹی‘ لاہور

وجہ یا کوتاہی سے وہ قرآن پاک کو بھول چکے ہوتے ہیں۔

قابلِ فکر ہیں وہ عوامل جن کی وجہ سے ایک حافظ قرآن اپنی سخت محنت سے کیے ہوئے حفظ کو بھول جاتا ہے۔ آیئے ان عوامل کو دیکھتے ہیں۔

حافظ قرآن کے قرآن پاک کو یاد رکھنے میں چار عوامل ہوتے ہیں۔ خود حافظ قرآن‘ اس کے اساتذۂ کرام‘ اس کے والدین اور معاشرہ۔ ہمارے پاس عموماً ایک حافظ قرآن پانچویں جماعت کے بعد حفظ کرنا شروع کرتا ہے۔ اس کی عمر اس وقت کم وبیش دس‘ گیارہ سال ہوتی ہے۔ عموماً دو اڑھائی سال میں وہ حفظ کر لیتا ہے۔ اس وقت اس کی عمر بارہ‘ تیرہ سال ہوتی ہے۔ اس عمر کا بچہ شعور کی اس پختگی میں نہیں ہوتا کہ وہ حفظ قرآن کی اہمیت سے واقف ہو۔ وہ اس بات پر ہی بڑا خوش ہوتا ہے کہ اس نے حفظ کر لیا ہے اور لوگ اسے حافظ قرآن کہنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر میں حافظ قرآن بچے کو بریٔ الذمہ قرار دیتا ہوں۔ اس کی یہی بڑی ہمت ہے کہ اس نے سخت محنت کی اور اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔

مدارس اور اساتذۂ کرام سے اس ضمن میں دو گزارشات ہیں۔ اول یہ کہ دورانِ حفظ وہ بچے سے سبقی اور منزل باقاعدگی کے ساتھ سنیں اور اس میں کسی قسم کی سستی نہ کریں‘ اور بچے کو کسی اور کام میں کم سے کم اُلجھائیں‘ مثلاً کسی کے گھر یا قبر پر قرآن پاک پڑھنے کے لیے جانا۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ ایک دفعہ معمول سے نکلنے کے بعد حافظ کو دوبارہ واپس آنے میں دشواری ہوتی ہے اور پھر شیطانی حملے بھی پے در پے ہیں۔ مدارس اور اساتذہ حفظ کے بعد کچھ وقت صرف اور صرف حافظ کی منزل یاد کروانے پر لگائیں‘ اور اس کو اس وقت تک مدرسے سے فارغ نہ کریں جب تک کہ اس کی منزل بہت اچھی طرح یاد نہ ہو جائے۔ اگر ممکن ہو تو فارغ ہونے کے بعد بھی اس کی منزل سنتے رہیں۔

دوم یہ کہ اساتذۂ کرام دورانِ حفظ جسمانی سزا سے حتی الامکان پرہیز کریں۔ حافظ قرآن کے سخت شب و روز اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جسمانی سزا حافظ قرآن کو اس کے مقصد سے ہٹاتی اور اس کو بغاوت پر اکساتی ہے۔

حافظ قرآن کے حفظ کو یاد رکھنے یا بھولنے میں بڑا ہاتھ اس کے والدین کا ہے۔ مدارس اور اساتذۂ کرام نے حافظ کو حفظ کروا دیا اور اس کی منزل کو یاد کروا کر اس کے والدین کے حوالے کر دیا۔ اب والدین کے کرنے کا کام شروع ہو گیا۔

جب بچہ قرآن پاک حفظ کر لیتا ہے تو والدین کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کو جلد از جلد دوبارہ سکول داخل کروا دیا جائے تاکہ بچہ بہت زیادہ پیچھے نہ رہ جائے۔ دیکھنے میں تو والدین کی یہ خواہش ٹھیک لگتی ہے‘ لیکن یاد رہے کہ تیس پاروں کا حفظ کر جانا‘ حفظ کے کاموں میں سے ایک کام ہے۔ ابھی دوسرا اور اس سے بھی زیادہ ضروری کام باقی ہے اور وہ ہے حفظ (منزل) کو پختہ کرنا۔ ہمارے ہاں بھولنے والے حفاظ کرام میں زیادہ تعداد ان حفاظ ہی کی ہے جو تیس پارے حفظ کر کے مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں اور منزل پکی نہیں کرتے۔ والدین کو چاہیے کہ تیس پارے حفظ کرنے کے بعد بچے کو سکول داخل کروانے کی بجائے اس کی منزل پختہ کرنے پر ضرور توجہ دیں اور کم از کم چھ مہینے اس کی منزل پختہ کرنے کے لیے رکھیں۔ منزل پختہ ہونے کے بعد اس بات کی خاصی امید ہے کہ بچے کو اس کی منزل یاد رہے گی۔

سب سے مشکل اور اہم مرحلہ اب شروع ہوگا۔ حافظ کو دنیاوی معاملات بھی نمٹانے ہیں اور اپنے حفظ کو بھی برقرار رکھنا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں زیادہ تر حُفّاظ ناکام ہو جاتے ہیں اور اپنی منزل بھلا بیٹھتے ہیں۔

منزل پختہ ہونے کے بعد والدین بچے کو سکول داخل کروا سکتے ہیں‘ لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ منزل پختہ اس وقت تک رہے گی جب تک بچہ اس کو بلاناغہ پڑھتا رہے گا۔ حافظ بچے کا شعور تو عمر کے اعتبار سے اس وقت اتنا پختہ نہیں اور وہ اس بہت بڑی کامیابی کی اہمیت سے بھی اتنا واقف نہیں۔ لہٰذا والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر روز حافظ سے ایک پارہ بلاناغہ سنیں اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ اور اگر ممکن ہو تو حافظ کا رابطہ مدرسے سے رہنے دیں اور اس کو ہر روز مدرسہ بھیجیں تاکہ وہ وہاں جا کر اپنی منزل سنا سکے۔ بصورتِ دیگر حافظ کی منزل سننے کے لیے کسی قاری صاحب کا بندوبست کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ اُس کی منزل بلاناغہ سنی جائے۔ آج کل حُفّاظ کی تعداد کافی زیادہ ہے اور ہر گلی محلے میں حفاظ موجود ہیں۔ حافظ کی منزل کو از بر رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حافظ کا ہم عمر کوئی دوسرا حافظ محلے میں ڈھونڈا جائے اور والدین اس بات کو یقینی بنائیں کہ دونوں حافظ ہر روز ایک دوسرے کو کم از کم ایک سپارہ ضرور سنائیں۔ منزل کو یاد رکھنے کا یہ ایک مؤثر عمل ہے۔ بہرحال یہ والدین کی ہی ذمہ داری ہے کہ وہ حافظ کی منزل سننے کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔

حُفّاظ کی منزل کو یاد رکھنے میں معاشرے کا بھی اہم کردار ہے۔ گلی محلوں میں مسجدیں بھی

ہیں اور حفاظ بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مساجد میں گاہے بگاہے حفاظ کی منزل کے مقابلے منعقد کروائے جائیں اور حفاظ کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں انعامات اور اسناد دی جائیں۔ اس طرح سکولوں اور کالجوں میں بھی حفاظ کی تعداد کافی ہے۔ حفاظ کی منزل کے مقابلے سکولوں اور کالجوں میں بھی منعقد کروائے جائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اب حفاظ کی تعداد کافی ہے۔ رمضان کے مہینے میں یہ کوشش کی جائے کہ ایک سے زیادہ حفاظ کو نمازِ تراویح میں منزل سنانے اور سننے کا موقع دیا جائے۔ نمازِ تراویح میں قرآن پاک سننا اور سنانا دراصل حفاظ کی منزل کا امتحان ہوتا ہے۔ نمازِ تراویح میں قرآن پاک سنانے اور سننے والے حفاظ پر بلاجواز تنقید کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

حفاظ کرام کو بھی چاہیے کہ جلد از جلد اپنے حفظ کی اہمیت کو جانیں اور کسی پر انحصار کرنے کی بجائے خود اپنی منزل کی فکر کریں اور روزانہ کی بنیاد پر اپنی منزل سنانے کا بندوبست خود کریں۔ اس منزل کی حفاظت کرنے پر اللہ تعالیٰ حفاظ کو دنیا اور آخرت میں سرخرو کریں گے۔

حافظ قرآن کی ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے سینے میں قرآن کی عظمت کو یاد رکھیں اور اس کے تقدس سے آگاہ رہیں۔ یعنی گناہ کے کاموں اور بری صحبت سے علیحدہ رہیں۔ خاص طور پر اپنی زبان کو بے ہودہ گفتگو سے بچا کر رکھیں کہ یہ وہ زبان ہے جو قرآن پاک پڑھتی ہے۔ اپنی نظروں کی حفاظت کریں‘ ہمیشہ سچ بولیں اور اپنے اخلاق کو قرآن کی تعلیمات کے مطابق مزین کریں۔ ایسا نہ ہو کہ حافظ کا عمل و کردار اس کے حفظ کی توہین کر رہا ہو۔

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالکؒ اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

”بیان القرآن“ کی تکمیل پر ہدیۂ تبریک

۱۸ ذیقعد ۱۴۳۶ھ / ۳ ستمبر ۲۰۱۵ء

گرامی قدر مدیر مسئول‘ شعبہ مطبوعات‘ انجمن خدام القرآن‘ ماڈل ٹاؤن لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ رب العزت آپ احباب اور جمیع مسلمانوں کو تمام تر ارضی وسماوی آفات اور دجال کے عون وانصار کے بپا کردہ فتنوں سے محفوظ و مامون رکھیں۔ آمین یا رب العالمین!

آج عریضہ تحریر کرنے کا سبب ”بیان القرآن“ کی جلد ہفتم ہوئی۔ بلاشبہ انجمن خدام القرآن‘ اس کے اراکین اور وہ تمام افراد جنہوں نے اس شاندار لوازمے کو کمال مشاقی‘ لگن‘ محنت‘ حسن ذوق اور ادب واہتمام سے بہترین طباعت وکتابت کے ساتھ شائع فرمایا وہ نہ صرف تحسین و ستائش کے مستحق ہیں بلکہ اللہ پاک اس خدمت کو ان شاء اللہ ان کے لیے توشہ آخرت بھی بنائیں گے۔ ایک مستحسن کام عمدہ طریقہ سے اختتام پذیر ہوا‘ ماشاء اللہ!

ابھی بیان القرآن ہی کی خوشی کم نہ ہوئی تھی کہ مکتبہ خدام القرآن لاہور کی طرف سے اہل وطن مسلمانوں کے لیے عابد اللہ جان صاحب حفظہ اللہ کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ بعنوان ”افغانستان: آخری صلیبی جنگ کا نقطہ آغاز“ بھی نظر نواز ہوئی۔ فی الحال تو محض چار عدد نسخے خریدے ہیں‘ ان شاء اللہ مزید دوستوں تک بھی یہ نہایت ہی شاندار کتاب جو نہ صرف فکر انگیز ہے بلکہ خرد افروز بھی‘ ترجمہ نہایت شستہ رواں اور عام فہم ہے‘ پہنچاؤں گا۔ کاش ہمارے دینی اداروں میں مغرب کی چالبازیوں‘ مکاریوں‘ صلاح کاریوں اور منصوبوں سے آگہی کے لیے فارغین طلبہ کرام کو ان اہم کتب جو کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق شائع ہو رہی ہیں یا ہوئی ہیں‘ نیز چیدہ چیدہ مضامین اور رپورٹوں کے ترجمہ وتجزیہ کے لیے مامور کیا جائے اور مدارس میں اس موضوع پر کوئی تحقیقی دریچہ بھی کھولا جائے۔ غالباً آج تک احقر نے کسی بھی مدرسہ کی جانب سے نہ تو Jewish Protocols اور نہ ہی لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے بارے میں کوئی تحقیق‘ تنقیدی اور مربوط کتاب دیکھی ہے‘ جبکہ یہ ادارے تو مدارس کے خلاف پروپیگنڈے کا جواب بھی بے دلی کے ساتھ دے رہے ہیں۔ Pragmaticism یا پھر کوئی بھی comparative study کا عظیم فقدان ہے۔ بلاشبہ مغرب سے کچھ نہ کہا جائے کہ ان کا خمیر اللہ بیزار ہے‘ وہ کسی الہامی کتاب سے محروم ہیں اور مادیت وشہوات نے ان کے حواس باختہ کر دیے ہیں‘ مگر ان کے ظلم وستم پر ترنت جواب اور ویسا ہی علم الکلام بھی کیا کفر ہے؟

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

بلاشبہ آپ نے جناب عابد اللہ جان حفظہ اللہ کی کتاب کا ترجمہ کروا کر اور اسے شائع فرما کر نہ صرف اردو زبان کا دامن جواہر سے بھر دیا ہے بلکہ محبانِ دین کو فکری سرمایہ اور ذہنی کشادگی کے ساتھ ساتھ ہمت اور فکر ونظر کے نئے دریچوں سے روشناس کرایا ہے۔

وہ کہتے ہیں نا کہ ع ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے! کچھ ایسا ہی معاملہ خاکسار کی اگلی خواہش سے ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ دار الترجمہ کی ابتدا جناب عابد اللہ جان صاحب کی کتاب سے ہی کی جائے اور پھر اس ضمن میں ان کی دوسری کتب ترجمہ کی جائیں۔ اسی طرح انہوں نے کتاب کے اندر بھی بہت سی اہم کتابوں کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ ان کا مختصر ترین خلاصہ اور اہمیت وافادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اللہ رب العزت آپ کے وسائل میں برکت پیدا فرمائیں اور آپ حضرات کو ہمت وطاقت عطا کریں‘ آمین!

آخر میں ایک مزید مبارک باد کہ ان کتب کی خریداری کے ساتھ ہی عاجز کو چھ ابواب پر مشتمل مختصر کتابچوں کی صورت میں مکتبہ تنظیم اسلامی کی شائع کردہ ایک مزید عمدہ اور معیاری کاوش بعنوان ”تزکیۂ نفس“ بھی دستیاب ہوئی۔ جستہ جستہ خواندگی کے بعد اندازہ ہوا کہ بلاشبہ ایک اصلاحی وتربیتی نوعیت کی مثبت کتاب ہے۔ مختصر کتابچوں کی صورت میں کتاب کی اشاعت بھی بجا طور پر مفید ہوگی۔ خریدنے میں سستی اور مطالعہ میں آسان رہے گی‘ مگر ایسی عمدہ اور مستقل ومتواتر اور بار بار پڑھنے والی کتاب کو اگر کتابچوں کے ساتھ ساتھ ایک جلد میں Hard Bound بھی شائع کیا جائے تو شاید یہ مزید کارآمد ہوگا۔ قیمت تو بلاشبہ کچھ بڑھ جائے گی مگر استفادہ اور مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ پوری کتاب محفوظ کرنے میں سہل ہو جائے گی اور مجلد ہونے کے سبب بوسیدگی سے بھی محفوظ رہے گی۔

اللہ تعالیٰ آپ کا‘ میرا اور جمیع مسلمین ومسلمات کا حامی وناصر ہو‘ ہمیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے اور اسلام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا ذا الجلال والاکرام!

والسلام ——— تنویر

53/1 کمرشل ایونیو‘ فیز IV‘ ڈیفنس سوسائٹی کراچی 75500

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۲)

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور اباجی

(گزشتہ سے پیوستہ)

مولانا سندھی نے ہمت نہ ہاری اور حالات و مصالح کے تحت ہند کانگریس کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ ۱۹۱۹ء کی جنگ جو افغانستان اور انگریزوں کے درمیان ہوئی' اس کے بڑے منصوبہ ساز بھی مولانا ہی تھے۔ اس جنگ کے نتیجے میں نومبر ۱۹۲۱ء کے امن معاہدے کے تحت افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان ایک مستقل امن سمجھوتہ طے پا گیا اور افغانستان کی خودمختاری محفوظ ہوگئی۔ لیکن ساتھ ساتھ مولانا اور ان کی انقلابی جماعت کے لیے خفیہ یا غیر خفیہ سیاسی کام کرنے کی راہیں بھی مسدود ہوگئیں۔ بالآخر حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ مولانا سندھی اور ان کے رفقاء کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں مولانا کی زیر قیادت دس ساتھیوں کا قافلہ ویزا حاصل کر کے روس روانہ ہوا۔ کئی دن کے پُرمشقت سفر کے بعد قافلے نے روسی سرحد پار کی اور پھر دریائی سفر کرتے ہوئے کرکی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اب مولانا اور ان کے ساتھی روس کی انقلابی حکومت کے مہمان تھے۔ بذریعہ ٹرین سفر کرتے ہوئے قافلہ تیسرے روز بخارا پہنچ گیا' جہاں اسے ایک کوٹھی میں ٹھہرایا گیا۔ آٹھ دن کے قیام کے بعد اس گروپ کی اگلی منزل تاشقند تھی' جہاں دو تین دن گزارنے کے بعد حسبِ سابق بذریعہ ریل قافلے والے آخر کار نومبر کے تقریباً وسط میں ماسکو پہنچ گئے' جہاں ان کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے لکس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ یہاں قافلے کے پڑھے لکھے نوجوان ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوگئے۔ تقریباً روزانہ شام کو ان کی مولانا سے نشست ہوتی۔ اس کا سب

سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا کو ان طلبہ کے ذریعے براہ راست سوشلزم اور کمیونزم کے فلسفے اور احوال و نظریات سے واقفیت نیز ان کے طریق تعلیم و تربیت کو جانچنے کا موقع ملا۔ اسی طرح ان نوجوانوں کو انقلابیوں کے اعتراضات کو مولانا کی مدد سے اسلام کی روشنی میں جانچنے کا موقع ملا۔ مولانا کے جوابات سے اکثر طلبہ اپنا ذہنی خلجان دور کرتے' اسلامی تعلیمات کی جامعیت پر ان کا یقین مزید پختہ ہو جاتا اور وہ اشتراکیت کے پروپیگنڈے سے بچ جاتے۔

اپریل ۱۹۲۳ء میں مولانا سندھی دو ساتھیوں کے ہمراہ تقریباً دو ہفتوں کے لیے لینن گراڈ بھی گئے' جہاں آپ مشہور مسلمان عالم علامہ موسیٰ جار اللہ کے مہمان رہے اور دونوں بزرگوں کے درمیان طویل علمی مجلسیں اور افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا۔ بقول مولانا سندھی آپ کی لینن سے ملاقات نہیں ہوئی بلکہ قیامِ ماسکو کے دوران جون ۱۹۲۳ء میں مولانا روسی وزیر خارجہ چچرن سے اپنے ساتھی ظفر حسن کی معیت میں ملے۔ اس ملاقات میں مولانا نے چچرن کو اس بات پر قائل کیا کہ روسی حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان انگریزوں کو نکالنے اور آزادیٔ ہند کے لیے ایک سمجھوتہ ہونا چاہیے۔ بعد کی تین ملاقاتوں میں مولانا نے روسی وزیر خارجہ کو اس بات پر بھی آمادہ کر لیا کہ کانگریس اور افغانستان دونوں کو ایک ایک کروڑ کی امداد دی جائے' تاکہ کانگریس آزادیٔ ہند کا کام کرے اور افغانستان کے ذریعے روس' ہندوستان سے رابطہ رکھ سکے۔ جب چچرن کے توسط سے روسی حکومت نے یہ تجویز مان لی تو مولانا نے اپنا پروگرام بتایا کہ وہ ترکی جا کر قابل اعتماد ہندوستانی اور افغانستانی رہنماؤں سے رابطہ کر کے ان کو اعتماد میں لیں گے اور عملی طریق کار طے کیا جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے ترکی رہ کر یہ کام نہ ہو سکا تو پھر حجاز جا کر مولانا حج پر آنے والے ساتھیوں کے ذریعے اپنا پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ لیکن بعد کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پابندیوں اور مجبوریوں کے تحت اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

جولائی ۱۹۲۳ء میں مولانا سندھی مولوی عزیز احمد (برادر مولانا احمد علی لاہوریؒ) کے ہمراہ ترکی کے لیے روانہ ہوئے اور راستے کے خطرات کے پیش نظر ایک خفیہ راستے سے سفر کرتے ہوئے انقرہ پہنچے۔ تقریباً چار ماہ کے قیام کے بعد مولانا استنبول منتقل ہوگئے۔ روس کے برعکس ترکی کی آب و ہوا نے مولانا کی صحت اور طبیعت پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔ ۱۹۲۵ء میں مشہور ہندوستانی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے ترکی کا سفر کیا۔ اس دوران مولانا سندھی اور ڈاکٹر انصاری کے درمیان طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں

مولانا کو پہلی مرتبہ براہ راست معلومات حاصل ہوئیں اور دونوں رہنماؤں کے درمیان آئندہ کے سیاسی منصوبوں کے بارے میں بھی تفصیلی تبادلۂ خیال ہوا۔مولانا نے جب ہندوستان سے ہجرت کی تھی تو اتحاد عالم اسلامی اور احیائے اسلام کے تصورات اور خاکے ان کے ذہن کے مرکز میں تھے۔اس ضمن میں مولانا نے ترکی میں بھی غالباً آخری کوشش کی کہ خلافتِ اسلامیہ ختم ہونے کے بعد ایک بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام ہی عمل میں آجائے۔اس حوالے سے آپ کی ترکی رہنما رؤف بک سے ملاقات طے پائی۔ جنرل کاظم قرہ بک پاشا بھی اس دوران موجود تھے۔اسلامی یونیورسٹی کی تجویز پیش ہونے پر رؤف بک نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ مخالف سیاسی پارٹی جو پہلے ہی ان پر قدامت پسندی کا الزام لگا رہی ہے‘ ان کی پارٹی پر اتحادِ عالمِ اسلامی کی مزید تہمت لگا کر انہیں جدید تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہ سے گرا دے گی۔مولانا یہ جواب سن کر سخت مایوسی کی حالت میں واپس اپنی قیام گاہ آ گئے۔ترکی میں قیام کے دوران مولانا نے علماء حضرات سے بھی تبادلہ خیال جاری رکھا اور ساتھ مطالعہ کتب کا شغل بھی جاری رہا۔مختلف ناموں سے مولانا نے کچھ مضامین بھی ترکی اخباروں میں شائع کروائے۔ساتھ ساتھ اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھنے شروع کر دیے۔قیامِ ترکی میں مولانا کی اہم سیاسی کاوش آزاد ہندوستان کا پہلا جامع دستوری خاکہ بعنوان ’’کانگریس کمیٹی کابل کا سوراجی پروگرام‘‘ اور ’’مہابھارت سوراجیہ پارٹی کا پروگرام‘‘ ستمبر ۱۹۲۴ء میں استنبول سے شائع ہوا۔

۱۹۲۵ء کے اختتام تک نجد اور حجاز میں ابن سعود نے شورشوں پر قابو پا کر اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔خصوصاً برصغیر میں اپنے خلاف پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے لیے اوائل ۱۹۲۶ء میں ابن سعود نے حج کے موقع پر ایک مؤتمر اسلامی کے انعقاد کا اعلان کیا‘ جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی جماعتوں کے نمائندہ ارکان نے شرکت کی۔جب مولانا کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے بھی سفرِ حجاز اور مسلمان نمائندوں سے تبادلۂ خیال کا ارادہ کیا۔لیکن راستے کی دقتوں اور طویل بحری سفر کے بعد جب مولانا سندھی اگست ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ پہنچے تو تاخیر ہونے کی بنا پر تمام مسلمان وفود واپس جا چکے تھے۔اب کہیں اور جانے کی بجائے مولانا نے حجاز میں ہی قیام کرنے اور مکمل طور پر انقلابی اور سیاسی سرگرمیوں سے اجتناب کا فیصلہ کیا۔حکومت حجاز کی طرف سے مولانا پر کوئی پابندی نہ تھی اور سیاسی پناہ گزیں ہونے کی بنا پر بوقت ضرورت مولانا کی مالی امداد کا بھی انتظام ہو جاتا تھا۔مولانا سندھی تقریباً بارہ برس حجاز میں رہے۔اس دوران ان کا زیادہ وقت مطالعہ کتب اور درس و تدریس میں گزرتا تھا۔آپ کو زیادہ دلچسپی مدرسہ صولتیہ

کے دینی‘ تعلیمی اور علمی ماحول سے تھی۔اس کا کتب خانہ آپ کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا ایک عمدہ ذریعہ تھا۔شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف کا مطالعہ اور ان پر گہرا غور وفکر مولانا کے اوقات کا ایک اہم مصرف تھا۔اس کے علاوہ قرآن پاک کے درس و تدریس میں بھی مولانا سندھی زیادہ تر مصروف رہتے تھے۔طلبہ کی سہولت کے مطابق اردو‘ سندھی اور عربی میں درس دیتے اور تفسیری نکات حل کرتے تھے۔جن حضرات نے مولانا کی مکمل تفسیر قرآن قلمبند کی‘ ان میں روسی عالم علامہ موسیٰ جار اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ان کی عربی میں تحریر کردہ تفسیر کو یہ امتیازی وصف حاصل ہے کہ اس پر مولانا سندھی نے بذاتِ خود نظرِ ثانی کی اور مؤلف کی کاوش پر اظہارِ مسرت کیا۔

دیگر تصانیف کے علاوہ مولانا اپنی قیامِ کابل کی مصروفیات اور مختصر حالاتِ زندگی کو بھی ضبط تحریر میں لے آئے۔شام کے وقت مولانا پابندی سے حرم میں بیٹھتے اور شائقین کے سوالوں کے جواب دیتے۔ایامِ حج میں مولانا سندھی کی مصروفیات بہت بڑھ جاتیں۔تمام دنیا سے آئے ہوئے مسلمان نمائندوں اور علماء حضرات سے مولانا کی مجالس ہوتیں۔اہل علم حضرات مولانا کی محفل میں شریک ہو کر اپنی علمی تشنگی دور کرتے اور آپ کے فرمودات سے مستفید ہوتے۔۱۹۳۸ء میں مولانا سندھی نے ڈاکٹر ذاکر حسین‘ رئیس جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پیغام بھیجا کہ اپنے ہاں سے ایک استاد میرے پاس بھجوا دیں تاکہ میں اپنی علمی میراث اسے منتقل کر سکوں۔انہوں نے پروفیسر محمد سرور کو بھیج دیا‘ جنہوں نے وہاں اور پھر مولانا کے ہندوستان پہنچنے پر یہاں بھی تعلق قائم رکھا اور آپ کے حالات اور ملفوظات پر کئی کتب شائع کیں۔

جمعیت علمائے ہند اور کانگریس کے حوالے سے مولانا سندھی کی وطن واپسی کی تحریک ایک عرصے سے چل رہی تھی۔۱۹۳۵ء کے آئین اور انتخابات کے بعد اس میں زور پیدا ہو گیا۔ بالآخر حکومت سندھ کی ضمانت پر مرکزی حکومت نے آپ کی واپسی کی اجازت دے دی۔ تقریباً ۲۵ برس کی جلاوطنی کے بعد مولانا سندھیؒ نے ۷/مارچ ۱۹۳۹ء کو بذریعہ بحری جہاز کراچی پہنچ کر وطن کی سرزمین پر قدم رکھا۔بندرگاہ پر دیگر استقبال کرنے والوں کے ہمراہ سندھ کے وزیر اعلیٰ اللہ بخش سومرو بھی موجود تھے۔کراچی میں کچھ ہفتے قیام کے بعد مولانا دین پور سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے‘ جہاں آپ کا قیام مولانا احمد علی لاہوری‘ امیر انجمن خدام الدین کے ہاں ہوا۔چند دن کے بعد مولانا نے دیوبند کا عزم کیا۔وہاں پہنچنے پر قبرستان میں فاتحہ خوانی کی اور مدرسہ میں اساتذہ وطلبہ سے ملاقات فرمائی۔آپ کے قیام کے دوران ہی دارالحدیث کے ہال میں مولانا قاری محمد طیبؒ‘ مہتمم دارالعلوم کی زیر صدارت ایک عظیم الشان

جلسے کا اہتمام کیا گیا‘ جس میں مولانا سندھی نے جامع خطبہ ارشاد فرمایا اور اپنی ہجرت کے اہم واقعات پر روشنی ڈالی۔ یہاں سے آپ کی دہلی تشریف آوری ہوئی۔ آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹھہرے اور ایک عوامی جلسے میں تقریر کی۔ واپسی پر آپ لاہور سے ہوتے ہوئے سندھ تشریف لے گئے اور اپنی مختلف النوع سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ساتھ دیگر شہروں میں بھی آپ کے تبلیغی اور سیاسی دورے جاری رہے۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں آپ نے مدرسہ دارالرشاد‘ پیر جھنڈا (سندھ) کے سالانہ اجلاس میں شرکت فرمائی اور اپنے خطاب کے دوران کانگریس کے اندر اپنی ذیلی سیاسی جماعت کا اعلان ’جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی‘ کے نام سے کیا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ نے جمعیت علمائے سندھ کے اندر ایک مستقل شعبہ ’جمعیت خدام الحکمت‘ قائم فرمایا۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۴۰ء کو مولانا جامعہ ملیہ دہلی میں ’یادگار شیخ الہندؒ‘ کے افتتاح کے موقع پر شریک ہوئے اور ایک پُرمغز خطبہ دیا۔

اس دوران مولانا سندھی نے مولانا احمد علی لاہوری سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ وہ اپنے درس میں سے دو طالب علم منتخب کر کے انہیں دے دیں‘ تاکہ وہ انہیں فلسفہ ولی اللّٰہی سمجھائیں اور انہیں اس فلسفے کی اشاعت کے لیے تیار کریں۔ چنانچہ مولانا لاہوری نے غازی خدا بخش اور شیخ بشیر احمد صاحبان کو حکم دیا کہ وہ مولانا سندھی کے ساتھ منسلک ہو جائیں اور جو وہ دیں‘ اسے حاصل کر لیں۔ (یہ دونوں اصحاب اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالا‘ لاہور میں استاد تھے۔) تعمیل ارشاد میں دونوں حضرات مولانا سے ان کے فلسفے کا درس لیتے رہے۔ چونکہ شیخ بشیر احمد بڑے زود نویس تھے‘ اس لیے وہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ مولانا سندھی کے ارشادات قلمبند بھی کرتے گئے۔ مولانا سندھی نے انہیں مختلف مسائل پر مقالات‘ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تشریحات اور قرآن پاک کی اکثر سورتوں کی تفاسیر املا کروائیں۔ یہ سلسلہ مولانا کے آخری ایام تک جاری رہا۔ اس طرح مولانا سندھیؒ کی املا کا ذخیرہ کئی ہزار صفحات پر پھیل گیا اور انہیں شیخ بشیر احمد نے پانچ ضخیم جلدوں میں محفوظ کر لیا۔ اپنی ہمہ جہتی مصروفیات کے ساتھ مولانا سندھی نے ۱۹۴۱ء میں رسالہ الفرقان (مدیر مولانا محمد منظور نعمانیؒ) کے شاہ ولی اللہ نمبر میں ایک پُرمغز مقالہ ’امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف‘ کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ ۱۹۴۳ء میں مولانا کی ایک اہم تالیف ’شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک‘ کے عنوان کے تحت شائع ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں مولانا سندھی کے شاگرد رشید پروفیسر محمد سرور جامعی کی ایک تالیف ’مولانا عبیداللہ سندھی...... حالات زندگی‘ تعلیمات اور افکار سیاسی‘ اشاعت پذیر ہوئی۔ ۱۵ر مارچ

۱۹۴۴ء کو مولانا سندھی نے ’’ولی اللہ سوسائٹی‘ لاہور‘‘ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ سوسائٹی کا صدر غازی خدا بخش اور جنرل سیکرٹری شیخ بشیر احمد لدھیانوی کو مقرر کیا گیا۔ اس کا مقصد شاہ ولی اللہؒ کے فلسفے کی اشاعت‘ اس کی تشریح کے لیے کتابیں اور رسالے اور اس کی تدریس کے لیے درس گاہیں قائم کرنا‘ قرار پایا۔ طے کیا گیا کہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ مولانا نے اسلام کے جامع نظام تعلیم کے تحت نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے محمد قاسم شاہ ولی اللہ کالج‘ لاہور‘ قائم کرنے کا پروگرام شائع کیا‘ جس میں جدید و قدیم علوم کو فلسفہ شاہ ولی اللہ کے ساتھ جمع کیا گیا۔ قیام لاہور کے دوران ہی آپ کی طبیعت خراب ہوگئی‘ لیکن آرام کرنے کی بجائے آپ اپنے مجوزہ منصوبوں اور لائحہ عمل کی فکر میں ہی گھلتے رہے۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں باوجود بیماری کے آپ حیدر آباد اور شمالی سندھ کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔ جب صحت زیادہ ہی خراب ہوگئی تو کراچی کا رخ کیا۔ ۷ر اگست ۱۹۴۴ء کو مولانا شدید علالت میں دارالرشاد‘ گوٹھ پیر جھنڈا تشریف لے گئے۔ سفر کے باعث طبیعت بہت گر گئی لیکن زبان پر اللہ اللہ کا ورد جاری رہا۔ ۸ر اگست کو آپ نے فرمایا کہ علامہ ڈاکٹر اقبال نے ’نیا شوالہ‘ کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے‘ وہ لاؤ۔ کتب خانہ سے بانگ درا منگوائی گئی اور آپ کے خادم عزیز اللہ جروار نے اسے پڑھ کر سنایا۔ جس شعر میں غیریت اور دوئی کے پردوں کا ذکر ہے‘ وہ بار بار دہراتے رہے۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں‘ نقش دوئی مٹا دیں!

بعد میں مولوی دین محمد وفائی اور دیگر علماء تشریف لے آئے۔ ان سے فرمایا کہ میں بہت خوش ہوں کہ اللہ کے فضل سے میرا باطن بالکل ٹھیک ہے‘ یہ میں بطور تحدیثِ نعمت کہتا ہوں‘ میری مشکلات اللہ تعالیٰ نے دور کر دی ہیں۔ مولوی عزیز اللہ کے ذریعے مولانا نے یتیموں اور بیواؤں میں پیسے تقسیم کروائے۔ ۹ر اگست کو مولانا کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تو آپ نے محمد قاسم شاہ ولی اللہ کالج کے بارے میں استفسار فرمایا۔ مولوی بشیر احمد لدھیانوی نے بتایا کہ آپ کی تصحیح کردہ تقریر بابت سورۂ مزمل‘ مدثر لاہور میں چھپنی شروع ہوگئی ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ۱۵ر اگست کو مولانا سندھی نے دین پور جانے کا عزم ظاہر کیا۔ چنانچہ خُدّام اہتمام کر کے آپ کو وہاں لے گئے۔ ۲۱ر اگست ۱۹۴۴ء کو رمضان المبارک کی پہلی تاریخ تھی۔ مولانا روزے سے تھے۔ عصر کی اذان کے بعد ابھی جماعت کھڑی نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے اس دارفانی کو الوداع کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

ذیل میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں: ''جب سے دہلی پر برطانوی قبضہ ہوا' ہمارے ملک کے نورانی چہرے پر غلامی کا سیاہ داغ لگ گیا۔ دیوبندی اسکول (مکتبۂ فکر) کا نصب العین یہ ہے کہ اس دھبے کو دور کرنے کی جِدّوجُہد میں مصروف رہا جائے۔'' ایک موقع پر مولانا نے شیخ الہندؒ کے حوالے سے دیوبند کے مقصدِ تاسیس کو یوں واضح کیا: ''یہ مدرسہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست کی تلافی کی جائے۔'' جہاد کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا رہا ہے کہ اس کے لیے مسلمان بادشاہ اور طاقتور اسلامی حکومت کا ہونا لازم ہے کہ ان کی طرف سے اعلانِ جہاد ہو۔ لیکن کیا ایسا نہ ہونے کی صورت میں فریضۂ جہاد ساقط ہو جائے گا؟ اس کا جواب مولانا یوں دیتے ہیں کہ ''حضرت شیخ الہندؒ نے اس مشکل مسئلے کو ہمیں سمجھایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ ایسے حالات میں ہر ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ خود اپنی جماعت بنائے اور جہاد کرے''۔☆ ایک موقع پر مولانا سندھی نے شیخ الہند سے اپنے تعلق اور اکتسابِ فیض کا ذکر یوں کیا ہے: ''وہ دن (دیوبند میں تعلیم کے آغاز کا دن) ہے اور آج کا دن (۱۹۴۰ء کے بعد کا دور)' حضرت شیخ الہندؒ سے میری یہ وارفتگی قائم ہے۔ میں نے جو کچھ پایا' ان کی ذات سے پایا۔ ان ہی نے مولانا محمد قاسم (نانوتوی) کی راہ دکھائی۔ ان ہی کی بدولت حضرت شاہ ولی اللہ سے عقیدت نصیب ہوئی۔ الغرض جو کچھ ہوں' سب ان ہی کی ذات کا فیض ہے''۔ قیامِ روس میں مولانا اشتراکی نظریات سے قطعاً متاثر نہ ہوئے' بلکہ اس سے آپ کے ایمان کو جلا ملی۔ بقول مولانا: ''میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ ماسکو کی (اشتراکی) تحریک کا مفصل مطالعہ کرنے کے بعد میں اپنے عقائد کو محفوظ رکھ سکا اور ہندوستان جیسے ملک میں بہ اطمینانِ خاطر کام کرنے کا راستہ معین کر لیا۔'' ایک دوسری جگہ مولانا کی اس ضمن میں تحریر ہے کہ: ''ماسکو میں رُکا' سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ میرے اس مطالعے کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی اس مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کی شاخ ہے' اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تجاویز سوچنے میں کامیاب ہوا''۔

مولانا سندھی سراپا انقلاب تھے' اپنی طویل جلاوطنی کے بعد جب آپ کراچی کی بندرگاہ پر اترے تو آنے والے استقبالیہ ہجوم کو مخاطب ہوتے ہوئے آپ نے فرمایا:

☆ واضح رہے کہ شیخ الہندؒ نے یہاں ''جہاد'' کی اصطلاح اس کے جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال کی ہے۔ (مرتب)

''میں انقلاب کا پیامبر بن کر ہندوستان لوٹا ہوں۔ وہ دن دور نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ والوں کو اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس انقلاب کو قیامت سے کم مت سمجھئے گا۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ایسے فلسفے کو قبول کر لو جس کی ترجمانی امام ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے۔ میں نے انگریز کی بیخ و بنیاد کو اکھیڑ دیا ہے۔ اب وہ ہندوستان میں نہیں رہ سکتا۔''

شاہ ولی اللہؒ سے اپنی بے مثال وابستگی کا اظہار مولانا سندھی نے یوں کیا ہے:

''میں اپنا امام (شاہ) ولی اللہ دہلویؒ کو بنا چکا ہوں' جو اپنی انقلابی سیاست میں اسلام کی صورت اور معنی کا کامل محافظ ہے' نیز اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی کے لیے امام ولی اللہ کے طریقے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

اس دور میں 'ہندوستانی قومیت' ایک معرکۃ الآراء بحث کا عنوان تھا۔ مولانا سندھی کے افکار میں قومیت کی بحث بڑی اہم ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اس حوالے سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے نقطۂ نظر کو یوں واضح کرتے ہیں:

''اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قومیت سے ہماری مراد وہ نیشنل ازم نہیں ہے جس کی وجہ سے قومی عصبیت کا نشوونما ہوتا ہے اور ایک قوم اپنے مقابلے میں دوسری قوموں کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس معنی کے اعتبار سے اسلام قومیت کا شدید دشمن ہے اور خود مولانا سندھی بھی اس نیشنل ازم کے قائل نہیں ہیں۔ قومیت سے مراد وہ عبادات و خصائل ہیں جو کسی ایک جماعت کا شعار بن گئے ہوں اور ان کی وجہ سے وہ جماعت دوسری جماعتوں یا قوموں کے مقابلے میں ممتاز سمجھی جاتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں قومیت کو قومی مزاج سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مولانا سندھی کا دعویٰ ہے اور بالکل بجا ہے کہ اسلام قومی مزاج کا لحاظ رکھتا ہے۔''

اس دعوے کو مولانا اکبر آبادیؒ نے مولانا سندھیؒ کے فکری مرشد امام شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیماتِ الٰہیہ کے حوالے سے بھی ثابت کیا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

''مولانا سندھی یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں (مسلمان اور ہندو) کسی ایک محاذ پر جمع نہیں ہوں گی' ان کے سیاسی اور وطنی مسائل کی گتھی سلجھ نہیں سکے گی۔ اس مشترکہ محاذ کا نام مولانا ''ہندوستانی قومیت'' رکھتے ہیں۔ اس کا مفاد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان باوجود اس ملک کی الگ الگ دو قوموں میں منقسم ہونے کے بہر حال ایک وطنی اشتراک رکھتے ہیں۔ اور اس اشتراک کی بنیاد پر اس ملک اور وطن کا جو مطالبہ ہندوؤں سے ہے وہی مسلمانوں سے بھی ہے۔

اور انہیں اس مطالبے کا جواب دینا چاہیے۔‘‘

مولانا سندھیؒ کی ذہنی ساخت کو سمجھنے کے ذیل کے دو واقعے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک تو پروفیسر محمد سرور جامعی نے اپنی کتاب ’افادات وملفوظات‘ میں نقل کیا ہے:

’’ایک دفعہ ان صاحب کی مولانا (سندھی) سے جامعہ نگر میں ملاقات ہوگئی اور آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ موصوف بات بات پر قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیتے۔ مولانا نے انہیں کہا کہ اپنی بات کیجئے اور قرآن کے حوالے نہ دیجئے۔ وہ پھر کسی آیت کا حوالہ دیتے۔ اس پر مولانا بگڑ گئے اور بڑے غصے میں کہنے لگے کہ تم ایسی غیر مؤثر کتاب کا حوالہ کیوں دیتے ہو کہ تم اسے برسوں سے پڑھ رہے ہو اور اس کا درس دے رہے ہو‘ وہ تم سے انگریز کی نوکری تک نہیں چھڑا سکی۔‘‘ (خیال رہے یہاں ’’ان صاحب‘‘ سے مراد غلام احمد پرویز ہیں۔)

دوسرا واقعہ شیخ محمد اکرام نے ’’موجِ کوثر‘‘ میں نقل کیا ہے:

’’مولانا (سندھی) ہندوستان آنے کے بعد برہنہ سر رہتے تھے‘ یہاں تک کہ نماز بھی بسا اوقات اسی طرح پڑھتے۔ ایک مرتبہ دہلی میں جامع مسجد کے قریب ہم میں سے ایک نے مولانا سے اس کے متعلق استفسار کیا تو کچھ حسرت اور کچھ غصہ کے لہجے میں فرمایا: میری ٹوپی تو اسی دن اُتر گئی جس دن دہلی کا لال قلعہ مجھ سے چھن گیا۔‘‘

مولانا عبید اللہ سندھی دینی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی کے بھی ترجمان تھے‘ لیکن وہ ’مولوی‘ پہلے تھے اور ’مسٹر‘ بعد میں۔ اس بارے میں ان کی تعلیمات کا نچوڑ مولانا کے اپنے الفاظ میں پڑھیے:

’’میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم زندگی کے اساس کی حیثیت دیں‘ لیکن یہ نہ سمجھیں کہ سائنس نے ساری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ بے شک سائنس نے مادّی دنیا میں جو انکشافات کیے ہیں‘ وہ سب صحیح ہیں‘ لیکن زندگی صرف مادہ تک ختم نہیں ہو جاتی‘ بلکہ یہ مادہ کسی اور وجود کا پرتو ہے۔ اور اس وجود کا مرکز ایک اور ذات ہے‘ جو خود زندگی ہے‘ اور زندگی کا سہارا اور باعث بھی۔ زندگی کا مادی تصورِ حیات اس لحاظ سے ناقص ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن زندگی کا صحیح اور مکمل تصور ’’ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً ‘‘ ہے اور یہی تصور ہے جو زندگی کی ساری کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے۔‘‘

(جاری ہے)

❁❁❁

عورت کا الگ رہائش کا مطالبہ

چند ضروری وضاحتیں

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

’’پاکستانی معاشرے میں ناگوار سمجھے جانے والے دو جائز کاموں‘‘ کے بارے میں میرے دو مضامین میثاق (فروری‘ اپریل ۲۰۱۵ء) میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے پہلی ناگوار چیز (پہلی بیوی کی موجودگی میں مرد کی دوسری شادی) والا مضمون تو قارئین کی اکثریت کو پسند آیا‘ لیکن دوسری ناگوار چیز ’’عورت کا الگ رہائش کا مطالبہ‘‘ کا بیان بعض حلقوں کو ناگوار معلوم ہوا۔ (اس لیے کہ وہ ہمارے معاشرے میں کچھ زیادہ ہی ناگوار ہے)۔ یقیناً اس بات کی تفہیم کے حوالے سے کوئی کوتاہی میرے ابلاغ ہی میں ہوگی کہ میں بات طریقے سے بیان نہیں کر پائی‘ ورنہ معاملہ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔

اس بات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے والد محترمؒ کی گفتگو کے ایک جملے کا ذکر کرنا ضروری ہے‘ جو مجھ تک میرے شوہر ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے ذریعے پہنچا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے (غالباً) شوریٰ کے اجلاس میں یہ بات کئی دفعہ کہی کہ ’’تم لوگ خواتین کے حقوق کے بارے میں کام کرو‘ کیونکہ اس محاذ پر اب تک کوئی خاص کام نہیں ہو سکا۔‘‘ مجھے نہیں اندازہ کہ والد محترم نے یہ بات کس حوالے اور کس تشویش کی بنا پر کہی ہے۔ لیکن مرد و خواتین کے عملی زندگی میں آپس میں کیا حقوق و فرائض ہیں؟ اس کا ہم سب کو واقعتاً شعور نہیں ہے۔ ہم ایک ایسے معاشرے کے افراد ہیں جہاں حقوق اللہ یعنی عبادات کا فہم تو کسی نہ کسی حد تک ہے‘ لیکن حقوق العباد (خصوصاً والدین اور زوجین کے حقوق) کے معاملے میں ہم روایات پسندی کا شکار ہیں۔ اور اسی مقام پر ہم سب کو سمجھنے سمجھانے میں مسئلہ آ رہا ہے۔

میرے پچھلے مضمون کے بارے میں میرے چھوٹے بھائی نے رہنمائی کی تھی کہ آپ والد محترم کا مضمون ’’اسلام کا معاشی نظام‘‘ کے ابتدائی صفحات کا مطالعہ کریں۔ اللہ ان کا بھلا کرے کہ انہوں نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس کو پڑھنے سے مزید انشراح ہوا کہ قانونی و فقہی نظام اور

اخلاقی و روحانی دونوں اہم اور ناگزیر تو ہیں‘ لیکن اخلاقیات کو قانون کا درجہ دے دینا ہی ہماری اصل غلطی ہے۔ یہ غلطی دانستہ و نادانستہ ہم سب سے سرزد ہو رہی ہے۔ خاندانی نظام میں یہ تین معاملات ایسے ہیں کہ جن میں قانونی پہلو اور اخلاقی پہلو باہم گڈمڈ کرنے کی وجہ سے بات سمجھنی مشکل ہو رہی ہے۔

(۱) کیا الگ رہائش (حسبِ استطاعتِ زوج) بیوی کا بنیادی حق ہے‘ جو اس کو ملنا چاہیے یا یہ ایک احسان والا معاملہ ہے؟ یعنی یہ قانونی تقاضا ہے یا اخلاقی؟ (اخلاقی پہلو میں تو ہر انسان کے اخلاق کا پیمانہ الگ ہو سکتا ہے جسے جبراً نافذ نہیں کیا جا سکتا۔)

(۲) ساس سسر کی خدمت بہو کا قانونی فرض ہے یا اخلاقی؟ اگر یہ قانونی فریضہ ہے تو اس فریضہ کی عدم ادائیگی پر وہ اوّلاً تنبیہہ اور بعد ازاں مستوجبِ سزا قرار پائے گی۔ اور اگر یہ ایک اخلاقی معاملہ ہے تو اگر اپنی آزاد مرضی اور محبت سے وہ ساس سسر کی خدمت کرتی ہے اور ان کے کام کاج میں تعاون کرتی ہے تو دنیا میں قابل ستائش و شکریہ اور آخرت میں اجر و ثواب کی مستحق ٹھہرے گی۔

(۳) والدین کی خدمت اصلاً بیٹے کا قانونی اور اخلاقی فرض ہے یا بہو کا؟ اگر یہ بیٹے کا ہے تو عدم ادائیگی کی بنا پر وہ احسان فراموش ہے‘ نافرمان ہے اور گناہگار ہے۔ اگر وہ اپنے اس فرض کو جبراً بیوی پر مسلط کرتا ہے اور بیوی کی جانب سے ہونے والی کوتاہی پر اسے ذہنی یا جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا ہے یا طلاق کی تلوار اُس پر سونت دیتا ہے تو وہ ظالم ہے‘ اپنی ڈیوٹی سے انحراف کر رہا ہے۔ اور آخرت میں اس کا وبال بھگت کر رہے گا۔ بیٹے پر والدین کی خدمت فرض ہونے کی صورت میں اگر بیوی اپنے شوہر پر عائد اس ذمہ داری میں اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے تو یہ اس کی جانب سے ایک خیر سگالی اور احسان والا معاملہ قرار پائے گا‘ جس پر وہ شکریہ کی مستحق ہوگی۔

قارئین کو اس قانونی اور اخلاقی پہلوؤں کی نزاکتوں کا متذکرہ بالا نظام حقوق و فرائض سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اسی لیے اس تحریر میں والد محترم کے افکار کی روشنی میں معاملے کی تسہیل سے پہلے مولانا طارق جمیل صاحب کے خطابات اور مولانا یوسف اصلاحی کی شہرۂ آفاق کتاب ’’آدابِ زندگی‘‘ سے بھی چند اقتباسات لیے گئے ہیں‘ جن سے مندرجہ بالا باتوں کی تائید ہوتی ہے اور ہماری غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔

مولانا طارق جمیل صاحب ایک بہترین داعی اور سب کی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ وہ عالم پہلے ہیں اور واعظ بعد میں۔ ذرا غور سے دیکھیں کہ اس ضمن میں وہ کیا فرماتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم

کے مزاجِ دین کے موافق نہ ہونے میں تو انہیں کوئی شک نہیں ہے۔ ساس سسر کی خدمت بہو کا فرض ہے یا نہیں‘ یہ ان سے سنیں:

’’ہمارا یہ حال ہے کہ گھر کے باہر اخلاق بگھارتے ہیں اور گھر کے اندر بداخلاقی کی انتہا ہے۔ رباط بن سارہؓ نبی پاک ﷺ کی محفل سے اُٹھ کر گئے اور جا کر زوجہ کو پانی پلایا۔ پھر کہا کہ میں نے تمہیں اس لیے پانی پلایا ہے کہ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ بیوی کو ایک گلاس پانی کا پلانا بھی ثواب ہے۔‘‘

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

’’مسئلہ یہ ہے کہ ماں باپ بیٹے کی تربیت نہیں کرتے کہ بیٹا کسی کی بیٹی لا رہے ہو تو وہ لوگ ارمانوں سے ڈولی میں بٹھا کر تمہارے حوالے کرتے ہیں —— تو آگے ساس بیٹھی ہے پنجے تیز کر کے اور شوہر بیٹھا ہے شیر بن کر —— ماں اپنی بیٹی کے لیے وکیل بن جاتی ہے اور بہو کے ساتھ ایسی ہے کہ جیسے اسے کسی نے جنا ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ یہ ہمیں کھلاتی نہیں‘ پوچھتی نہیں! تو سنو‘ بہو کے ذمے نہیں کہ ساس اور سسر سے پوچھے۔ اس کے ذمے صرف شوہر سے پوچھنا ہے۔ کوئی نہیں کہتا‘ میں کہہ رہا ہوں کیوں کہ یہ میرے دین کا حصہ ہے‘ میرے کام کا حصہ ہے۔ وہ نبی ﷺ جس نے سارے عالم کا دکھ اٹھایا وہ بیویوں کو خوش کر کے گیا ہے۔ دو مہینے فاقہ کر کے بھی وہ خوش ہیں‘ کیونکہ شوہر کا سلوک اچھا ہے۔ اور ہم شادی کے بعد چند دن آرام کروا کر بیوی کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔‘‘

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

’’ہمارے معاشرے میں ساس اور بہو انتہائی panic پیدا کرنے والا رشتہ بن چکا ہے‘ کیونکہ ہمارے معاشرے میں ساس اور سسر حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ساس سسر کا بہو پر شرعاً کوئی حق نہیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ وہ پہلے سے ذہن بنا کر بیٹھے ہوتے ہیں کہ پُتر کی شادی کی ہے تاکہ ہمیں کوئی کھلانے پلانے والی آئے —— یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے لیے چائے روٹی کا انتظام کروں‘ میری بیوی کے ذمے نہیں ہے۔ اگر وہ کرے تو اس کی نیکی اور احسان ہے‘ نہ کرے تو مجرم نہیں ہے۔ میں بڑے درد سے کہتا ہوں کہ ایک عورت جب ماں ہوتی ہے تو انگ انگ سے محبت پھوٹتی ہے‘ وہی ماں جب ساس بنتی ہے تو ایک ایک بال سے زہر نکلتا ہے۔ ایک مرد جب باپ ہوتا ہے تو شفقت کا پیکر ہوتا ہے‘ جب سسر بنتا ہے تو ظالم کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کے سلگتے ہوئے دکھ ہیں۔‘‘

ذیل میں مولانا یوسف اصلاحی صاحب کی کتاب ’’آدابِ زندگی‘‘ سے چند احادیث نقل کی گئی ہیں جو ہمارے موقف کو مزید مبرہن کر دیں گی۔ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ انسانی تعلقات اور رویوں کا جاننے والا اور اصلاح فرمانے والا اور کون ہوگا۔ کیا کبھی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ ہم جانیں کہ آپ ﷺ نے اس نازک معاملے میں کیا ارشاد فرمایا ہے؟ ہمیں اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی اعتماد ہے کہ ہم آپ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اپنے عمل (بلکہ بدعملی) کے لیے سہارے تلاش کرتے ہیں۔ جب اور کچھ نہیں ملتا تو ’’عرف‘‘ کو نص پر ترجیح دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے! مولانا یوسف اصلاحی صاحب ’’آدابِ زندگی‘‘ میں والدین کی خدمت کے حوالے سے بہت سی احادیث بیان کرتے ہیں جو ہمارے لیے بھی مشعل راہ ہیں اور ہمارے بیٹوں کے لیے بھی دنیا اور آخرت میں کامیابی‘ سکون اور جنت کا ضامن ہیں۔ ہمارے بیٹوں کو اور خود ہمیں بھی اگر یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ والدین (من جانب اللہ) اصلاً بیٹوں کی ذمہ داری ہیں تو ہماری توقعات اپنی بہوؤں سے بھی حدِ شریعت سے بڑھنے نہ پائیں گی اور نتیجتاً ہمارے گھر بھی ’’میدانِ جنگ‘‘ بننے سے محفوظ رہیں گے۔

اس کتاب کا باب سوم (تزئین معاشرت) ’والدین سے حسن سلوک کے آداب‘ ہم سب کو پڑھنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اپنے بیٹوں کو بھی پڑھائیں تاکہ ان کی سمجھ میں بھی آئے کہ پیارے نبی ﷺ نے والدین اور اولاد کے رشتے کو کس طرح ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کر دیا ہے کہ بیٹا ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا رہے۔ چند ایک احادیث یہاں لکھ رہی ہوں‘ باقی کا خود مطالعہ کریں:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: ’’کون سا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟‘‘ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’وہ نماز جو وقت پر پڑھی جائے‘‘۔ میں نے (پھر) پوچھا: ’’اس کے بعد کون سا کام اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟‘‘ فرمایا: ’’ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک‘‘۔ میں نے پوچھا: ’’اس کے بعد؟‘‘ فرمایا: ’’اللہ کی راہ میں جہاد کرنا‘‘۔ (بخاری و مسلم)

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں: ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ’’میں آپؐ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرتا ہوں اور اللہ سے اس کا اجر چاہتا ہوں۔ نبی ﷺ نے پوچھا: ’’کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟‘‘ اس نے کہا: ’’جی ہاں‘ بلکہ (خدا کا شکر ہے) دونوں زندہ ہیں‘‘۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تو کیا تم واقعی اللہ سے اپنی ہجرت اور جہاد کا بدلہ چاہتے ہو؟‘‘ اس نے کہا: ’’جی

ہاں! (میں اللہ سے اجر چاہتا ہوں۔)'' نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو جاؤ اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہ کر ان کے ساتھ نیک سلوک کرو''۔ (مسلم)

(۳) نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: ''وہ آدمی ذلیل ہو' پھر ذلیل ہو' پھر ذلیل ہو! لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون آدمی؟ آپ نے فرمایا: ''وہ آدمی جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا — دونوں کو پایا' یا کسی ایک کو — اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہوا۔'' (مسلم)

(۴) ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جہنم سے دور رہیں اور جنت میں داخل ہوں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیوں نہیں' اللہ کی قسم یہی چاہتا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ نے پوچھا: آپ کے والدین زندہ ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جی ہاں میری والدہ زندہ ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اگر تم ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو' ان کے کھانے پینے کا خیال رکھو تو ضرور جنت میں جاؤ گے' بشرطیکہ تم کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو''۔ (الادب المفرد)

(۵) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے دور میں موجود تھے مگر آپؐ کی ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ ان کی ایک بوڑھی ماں تھی' دن رات انہی کی خدمت میں لگے رہتے۔ نبی ﷺ کے دیدار کی بڑی آرزو تھی — اور کون مؤمن ہوگا جو اس تمنا میں نہ تڑپتا ہو کہ اس کی آنکھیں دیدارِ رسولؐ سے روشن ہوں — چنانچہ حضرت اویسؒ نے آنا بھی چاہا لیکن نبی ﷺ نے منع فرمایا۔ فریضہ حج ادا کرنے کی بھی ان کے دل میں بڑی آرزو تھی' لیکن جب تک ان کی والدہ زندہ رہی ان کی تنہائی کے خیال سے حج نہیں کیا اور ان کی وفات کے بعد ہی یہ آرزو پوری ہو سکی۔

یہ احادیث پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ ان ساری احادیث میں نبی پاک ﷺ نے بیٹوں کو اپنے والدین کی خدمت کا پابند کیا ہے۔ کسی ایک روایت میں بھی ایسا نہیں ملتا کہ شوہر اپنی بیویوں کو پابند کریں یا مجبور کریں کہ وہ اپنی ساس سسر کی بھی دل و جان سے خدمت کریں' بصورت دیگر ان کی زندگی اجیرن کر دی جائے (جیسا کہ آج ہمارے معاشرے کی ریت ہے)۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ وبا کیسے اتنی پھیل گئی کہ آج گھر گھر یا تو ساس کو بہو سے شکایت ہے یا بہو کو ساس سے۔ انہی وجوہات سے کتنے ہی خاندان اُجاڑ دیے جاتے ہیں۔ جبکہ ایسے گنے چنے خاندان جہاں ساس سسر کی خدمت قانونی طور پر نہیں بلکہ محض اخلاقی تقاضے کے طور پر' اور شوہر کی معاشی اور کاروباری مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے

سرانجام دی جاتی ہے' نیز اس خدمت کے اعتراف کے طور پر بہوؤں کو تشکر آمیز رویے' احترام اور دعائیں ملتی ہیں وہاں سکھ اور چین کی فضا قائم رہتی ہے۔ یہی حکمت ہے دین کے عطا کردہ نظامِ حقوق و فرائض میں۔ چناں چہ قرآن پاک میں بھی جہاں حقوق والدین کا ذکر ہے' (خاص طور پر بنی اسرائیل' لقمان اور احقاف میں) وہاں پر تکرار سے واحد مذکر کا ہی صیغہ آیا ہے' کہیں بھی تثنیہ کا صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ صرف ''بیٹوں'' سے خطاب ہے۔ یقیناً سب کے گھروں میں بیوی بلکہ بیویاں ہوتی تھیں (اور وہ کام کاج کے بغیر رہ بھی نہیں سکتیں... کہ ان کو کام کرنا ہی ہوتا ہے) لیکن اصلاً فرض کی نشاندہی کر دی گئی کہ یہ بیٹوں کا فرض ہے۔

اس اہم اور نازک مسئلہ کو امت کے نامور اہل فتویٰ نے بھی اہمیت دی ہے۔ چناں چہ فتاویٰ محمودیہ میں ہے کہ ''شرعاً بیوی کے ذمہ شوہر کی ماں (باپ) کی خدمت واجب نہیں' لیکن اخلاقی طور پر اس کا خیال کرنا چاہیے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے' تو اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہنچانے کا خیال رکھے اور شوہر کی اطاعت کرے۔'' (ج ۱۸ ص ۶۱۶)

اسی طرح ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں مولانا یوسف لدھیانویؒ رقمطراز ہیں: ''بیوی اگر خوشی سے شوہر کے والدین کی خدمت کرتی ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور بیوی کے لیے موجب سعادت ہے' لیکن یہ اخلاقی چیز ہے قانونی نہیں۔'' (ج ۶ ص ۳۴۲) مزید برآں وہ لکھتے ہیں: ''والدین کی خدمت اولاد کا فرض ہے اور اگر بیوی اپنی خوشی سے ان کی خدمت کرے تو اس کی سعادت ہے' لیکن اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔'' (ج ۶ ص ۳۴۳)

کفایت المفتی میں ہے: ''عرفی خدمت جس میں زوجہ پر کوئی مشقت اور تکلیف نہ ہو کرنی بہتر ہے' اس سے زیادہ زوجہ کے ذمے لازم نہیں۔'' (ج ۵ ص ۲۴۳)

فتاویٰ عالمگیری (الفتاویٰ الہندیہ) میں تو عجیب انداز سے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے:

''ان قالت لا اطبخ ولا اخبز قال فی الکتاب لا تجبر علی الطبخ والخبز و علی الزوج ان یأتیھا بطعام مھیأ او یاتیھا بمن یکفیھا عمل الطبخ والخبز' قال الفقیہ ابو اللیثؒ ان امتنعت المرأۃ عن الطبخ والخبز انما یجب علی الزوج ان یا تیھا بطعام مھیأ اذا کانت من بنات الاشراف لا تخدم بنفسھا فی اھلھا' او لم تکن من بنات الاشراف لکن بھا علۃ تمنعھا من الطبخ والخبز اما اذا لم تکن کذلک فلا یجب علی الزوج ان یأتیھا بطعام مھیأ' کذا فی الظھیریۃ۔'' (ج ۱/ص ۵۴۸)

ان نصوص کا مطالعہ بغرض رہنمائی کریں تو واقعتاً ہمارے مغالطے دور ہوں گے‘ ہم اندھیروں سے نکلیں گے۔ ان چیزوں کو واضح کرنے میں یقیناً ہمارا دنیوی کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ مطعون ہی ٹھہریں گے...... اَلْحَقُّ مُرٌّ...... لیکن کیا ہم عارضی فائدے کے حصول کے لیے حق تلفی سے کام لیتے ہوئے اپنی آخرت برباد کرنے پر تیار ہیں؟ کیونکہ ’’مفلس کون‘‘ والی حدیث میں اسی طرح کے رشتہ دار لوگ ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔ امیر محترم عاکف سعید کا خطابِ جمعہ ’طبعی محبتیں‘ ‘اس ضمن میں پڑھنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔

مندرجہ بالا احادیث اور مولانا طارق جمیل صاحب کے بیان کے مطابق سورۃ النساء کی آیت کا یہ حصہ ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ ’’نیک عورتیں تو وہ ہوتی ہیں جو فرمانبردار ہوں اور غیب میں حفاظت کرنے والیاں ہوں اللہ کی حفاظت کے ساتھ‘‘۔ بعض اہلِ تاویل نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ غیب سے مراد شوہر کے اہل خانہ ہیں۔ اہل خانہ کے لفظ سے اگر شوہر کے ماں باپ بھی مراد لیے جائیں اور جمہور مفسّرین کی تعبیر کو بالکل نظر انداز بھی کر دیں تب بھی مردوں کا فرض یعنی ان کی ذمہ داری والدین کے حوالے سے ہرگز ہرگز ساقط نہیں ہوتی۔ ہم دین سے نابلد خواتین کو تو یہ بات کسی طرح ہضم ہی نہیں ہوتی اور زندگی کی اس سٹیج یعنی بڑھاپا+ تنہائی پر پہنچ کر بھی اپنے آخری انجام سے بے خبر رہتی ہیں۔ اپنی جیسی خواتین کے لیے تو میں یہ اشعار پڑھ کر آگے چلوں گی۔

بڑھاپے میں پا کر پیامِ قضا بھی   نہ چونکا نہ جیتا نہ سنبھلا ذرا بھی
کوئی تیری غفلت کی ہے انتہا بھی   جنوں کب تلک‘ ہوش میں اپنے آ بھی
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے   یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے!

تو میں یہاں نوجوانوں سے درخواست کرتی ہوں کہ اے بیٹو! اگر دنیا کی کمائی کے اوقات کم کر کے والدین کی خدمت کے لیے بھی ٹائم رکھ لیا کرو تو کم از کم آخرت کی کمائی تو ہو جائے گی اور تھوڑی کمائی میں برکت بھی بہت زیادہ ہوگی۔ ضروری نہیں ہے کہ سارا دن کمائی کر کے ہی دولت حاصل ہوگی۔ دولت تو قناعت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ والدین اور اولاد کہ جن کے بیٹے والدین کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ والدین کی دعاؤں سے مالا مال ہو کر دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوتے ہیں۔ تو اے بیٹو! تم اگر باہر سے تھکے ہارے آئے ہو (اگر نہ بھی تھکے ہوئے آئے ہو تو مائیں محسوس کروا دیتی ہیں) تو کیا ہوا۔ والدین کی خدمت کرو گے تو ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ دلی سکون کے علاوہ رحمتوں کا نزول ہوگا۔ کیا تم نے وہ واقعہ نہیں سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ قیامت کے دن میرا ہمسایہ کون ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

ایک موچی۔ لمبی بات ہے‘ لیکن ایک رسولؑ کا ہمسایہ بننے کی اصل وجہ والدہ کی خدمت تھی‘ جو وہ موچی دل و جان سے کرتا تھا۔ تو ماں اس کو دعا دیتی تھی کہ ’’اے اللہ اس کو جنت میں موسیٰ علیہ السلام کا ہمسایہ بنانا‘‘۔ اسی طرح غار کے دہانے سے بڑا پتھر ہٹنے کی ایک وجہ ایک آدمی کا اپنے والدین کی خدمت کرنا بھی تھا۔ (اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تم والدین کے آگے بالکل ہی سر جھکا دو اور بیوی اور بچوں کے حصے کا ٹائم بھی ان کو ہی دے دو۔ (اعتدال کی ہر جگہ ضرورت ہے۔) ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم مائیں بیٹوں کو ہر قسم کے احساسات سے عاری کر کے صرف پیسہ بنانے کی مشین ہی بنانا چاہتی ہیں۔ جب وہ احساسات سے عاری مشین بن جاتے ہیں تو والدین کے ضمن میں اپنی ذمہ داریاں پورے طمطراق کے ساتھ بیوی کے سر پر دھر دیتے ہیں۔ مائیں بھی اپنے لاڈلوں کے اس ’’مردانہ کردار‘‘ پر خوش رہتی ہیں کہ اس سے معاشرے میں ان کی اتھاریٹی کی دھاک قائم رہتی ہے۔

دراصل ہمیں اپنا قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔ خدارا سوچیں اس دنیا میں دیے گئے بہت تھوڑے اختیار کو غلط استعمال کر کے ہم ہلدی کی گانٹھ لے کر دنیا میں پنساری بھی بن جائیں گے تو آخرت میں یہ اختیار بھی ہم سے چھن جائے گا‘ اور ہمارے منہ سے یہ تو نہیں نکلے گا کہ ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ (الحاقۃ:۲۹) کہ (ہماری شامت اعمال) ہمارے پاس سے اختیار بھی ختم ہو گیا۔ اپنے اپنے فرائض کو پہچان کر ان کو احسن طریقے سے ادا کرنا اور اس کے اجر کی صرف اور صرف اللہ ہی سے توقع رکھنا دنیا و آخرت میں کامیابیوں کی کنجی ہے۔ ﴿اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ﴾

آخر میں مستند علماء کی تصریحات کی روشنی میں اس دوسری ناگوار چیز کو والد محترم کے بیان کردہ اصولی موقف کی روشنی میں دیکھنے سے بات بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا مغالطوں کا اصل سبب ہمارا اسلام کے قانونی و فقہی اور روحانی اور اخلاقی پہلو کو گڈمڈ کر دینا ہے۔ محترم والد صاحب (ڈاکٹر اسرار احمدؒ) کے مضمون ’’اسلام کا معاشی نظام‘‘ کے بالکل شروع کے صفحات میں سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے‘ ذرا غور سے مطالعہ کریں۔ اسلام کے قانونی اور فقہی نظام اور اسلام کے روحانی و اخلاقی نظام کو واضح کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

> ’’اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہوگی۔ ان میں سے ایک اسلام کا رُوحانی و اخلاقی نظام ہے اور دُوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔‘‘

مزید ایک جگہ نظام وراثت اور ’قُلِ الْعَفْوَ‘ کے روحانی و قانونی نظام کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ

(ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے) کی شخصیت کے حوالے سے سمجھانے کے بعد فرماتے ہیں:

''یہ نظامِ اسلامی کا وہ رُوحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب دینا چاہتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور رُوحانی مراتب کے حصول کے لیے آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہے' اور اس سے اوپر احسان کا درجہ بھی ہے۔ مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جا رہا ہے......''

ان اقتباسات نے حقیقت بالکل کھول کر رکھ دی ہے۔ جس مغالطے کی صراحت والد محترم نے معاشی تعلیمات کے ضمن میں بیان فرمائی ویسا ہی مغالطہ اسلام کے معاشرتی نظام کے ضمن میں بھی لاحق ہو جاتا ہے اور اس کی بہت بڑی وجہ بھی انہوں نے بیان کر دی کہ قانونی نظام اور اخلاقی نظام کو گڈمڈ کر دینا۔ قانونی نظام کو اخلاقی نظام اور اخلاقی نظام کو قانونی نظام کا درجہ دینا ہماری اپنی تقصیر ہے' جبکہ دین کی عادلانہ تعلیمات کے تقاضے مختلف ہیں۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ۔ حقائق سے انحراف اور جانتے بوجھتے کتمانِ حق کے مرتکب ہونا فی نفسہٖ بہت بڑا جرم اور ظلم ہے۔

اس ضمن میں تین باتوں کو اگر ہم سمجھ لیں تو معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ قانونی تقاضے اپنی جگہ پر واضح اور الگ ہونے چاہئیں اور اخلاقی تقاضے اپنی جگہ پر واضح اور الگ ہونے چاہئیں۔ اللہ کے ہاں ان دونوں کے بارے میں پوچھ ہوگی... لیکن ان کی باہمی نسبت و تناسب کے اعتبار سے۔ یہ درست نہیں ہو سکتا کہ قانونی تقاضے تو پورے نہ ہوں اور اخلاقیات کے درس سنائے جائیں۔ یہ دین کے نظام کو تہ و بالا کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی شخص نوافل اور تہجد کا اہتمام تو رکھے لیکن فرض نماز کو باقاعدگی سے ادا نہ کرے۔ گویا مچھر چھاننے کا پورا اہتمام ہو اور اونٹ سموچے نگلے جا رہے ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ میری گزارشات پر ردِّعمل ظاہر کرنے سے پہلے کسی مستند عالم دین یا مفتی سے بھی پوچھ لیا جائے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں:

(۱) عورت کا الگ گھر کا تقاضا (اگر حالات متقاضی ہوں تو) ایک جائز مطالبہ ہے۔ (۲) والدین کی خدمت اور ان کا خیال رکھنا اور اُن کے ساتھ بہترین اخلاق رکھنا اور ان کا معروف میں حکم ماننا (سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے احکامات سے متعلق جو آیات ہیں ان سب پر عمل کرنا) اصل میں فرض ہے بیٹوں کا۔ ہمیں اپنے ''بیٹوں'' کو یہ بات باور کرانا پڑے گی۔ (۳) بہو پر اپنے شوہر کے والدین کا ادب و احترام قائم رکھنا لازم ہے۔ اسی طرح شوہر کے مال' عزت اور ناموس کی حفاظت بیوی پر لازم ہے۔ البتہ اس کی اصلاً حیثیت بیوی اور بہو کی ہے' گھر کی خادمہ کی نہیں۔

خادمہ تو دور کی بات ہے' مرد کے ذمہ تو یہ بھی ہے کہ اگر خاتون کسی وجہ سے کچن اور اور دیگر گھریلو کام کاج سے انکار کر دے تو وہ اس کی خوراک وغیرہ کا بندوبست کرے۔ یہ اس کا شرعی حق ہے۔ لیکن اگر وہ خوشی سے یہ کام سرانجام دے تو یہ اس کی جانب سے احسان کی روش ہے جس کا جواب بھی احسان ہی سے دیا جانا چاہئے۔ هل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ چناں چہ خاوند کی اطاعت اُس پر واجب ہے' لیکن صرف معروف اور مشروع حدود کے اندر اندر۔ لہٰذا اسے جبراً گھر بھر کی خادمہ بنا دینا دینی اعتبار سے ناجائز ہے۔ بدقسمتی سے یہ ناجائز عمل آج گھر گھر ہو رہا ہے' اِلا ماشاء اللہ۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اسلامی قوانین کے ساتھ اخلاقیات کا عمل دخل نہ ہو تو زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی احادیث جس سے کہ والدین کی خدمت بیٹے کے ذمے ثابت ہوتی ہے ان کو زبردستی ہم بہو کے ذمے نہ لگائیں۔

اگر میں مرد ہوتے ہوئے یہ بات کرتی تو شاید آسان تھا' لیکن میں تو خود عورت ہوں اور فی الحال پانچ بچوں کی ساس ہوں' تو بظاہر احوال تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہوں کہ خود بھی اپنی بہوؤں کو ''ذمہ داریوں'' سے دستبردار کر کے اپنا بڑھاپا خراب کر رہی ہوں اور بیٹے بھی پتا نہیں اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں یا نہیں' یہ سب کچھ اللہ جانتا ہے۔ میرا کام میری اپنی انا یا کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنا نہیں ہے۔ جو اللہ آج ہماری مدد کر رہا ہے وہ کیا ہمیں بڑھاپے یا بیماری میں تنہا چھوڑ دے گا؟ ان شاء اللہ' ایسا نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسا حق ہے جس کو چھپا کر اور بدنیتی سے اپنے مفادات کے سانچے میں ڈھال کر ہم نے دنیا میں بھی اپنے گھروں کا چین و سکون برباد کیا ہوا ہے اور آخرت میں تو کتمانِ حق اور ظلم کے مرتکب گردانے جائیں گے (اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ)۔

قرآن پاک کی سورۃ النساء میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ......﴾ (النساء: ۱۳۵)

''اے اہلِ ایمان' کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر خواہ یہ (انصاف کی بات اور شہادت) تمہارے اپنے خلاف ہو......'' تو اگر یہ حق مجھ پر اللہ نے منکشف کر دیا ہے اور یہ اگر میرے ہی خلاف ہے' دُنیوی طور پر کہ اگر میری کوئی حیثیت نہیں رہے گی تو کیا میں حق نہ بتاؤں؟؟ کیا میں پھر بھی اپنی' اپنے بچوں کی اپنے شوہر کی اور جملہ مہمانوں کی (جو آتے جاتے رہتے ہیں) ان سب کا بوجھ جبراً اور بالاکراہ اپنی بہوؤں پر ڈال دوں کہ ہاں یہ اس بہو کا فرض ہے!!! ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (بنی اسراءیل: ۱۵) کے مصداق آج اگر ہم نے یہ خود ساختہ فرض کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال بھی دیا تو قیامت کے دن بہوئیں' جو آج مجبور ہیں' وہ سارا بوجھ ہم پر ڈال دیں گی۔ جب اللہ فرما رہے ہیں کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا تو ہم

کیوں نہیں سوچتے کہ قانونی طور پر تو ان پر یہ فرض ہے ہی نہیں۔ رہی اخلاق کی بات تو جیسے قانون ہر ایک پر لاگو ہوتا ہے یعنی ساس‘ سسر‘ بہو‘ نند‘ شوہر وغیرہ یعنی جو خاص طور پر یہاں زیر موضوع ہیں‘ اسی طرح اخلاق بھی کسی ایک پر لاگو نہیں ہو سکتا‘ وہ بھی ان تمام رشتوں پر یکساں ضروری ہے۔ ہم بہو کے لیے تو اخلاقیات کے انبار لگا دیتے ہیں اور صرف اسی کو ہر جگہ قربانی کا درس دیتے ہیں جبکہ اپنے بیٹوں کو اور خود تو لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے کوئی سند لے کر آئے ہیں کہ ہمارے اخلاق کے بارے میں کوئی نہ بولے۔ یہ ہمارے اعمال اور اقوال کا تضاد ہے۔ اگر تقویٰ‘ صبر‘ ایثار‘ قربانی‘ عفو و درگزر‘ رحم یہ دوطرفہ اللہ کی رضا کے تحت اخلاقِ حسنہ کیے جائیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف ﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾﴾ (حٰم السجدۃ) ”تم مدافعت کرو بہترین طریقے سے تو (تم دیکھو گے کہ) وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ گویا کرم جوش دوست بن جائے گا“۔ والی تصویر آمنے سامنے آئے گی بلکہ یہ سارے رشتے ساس بہو سمیت ایک دوسرے کے ہمدرد بن جائیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خالصتاً اللہ کی رضا کے تحت ہو نہ کہ دنیوی غرض‘ اور دنیوی منفعت کے پیش نظر دوسرے سے اچھے اخلاق کی توقع رکھنے کی بجائے سب سے پہلے خود بہترین اخلاق پیش کر کے دکھائیں۔ خود اُسوہ بنیں تو غلام بھی اپنے آقا کے گرویدہ ہو جاتے ہیں (نبی پاک ﷺ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مثال) تو یہ تو پھر آزاد محصنہ خواتین ہیں۔ ان کے ساتھ حسن سلوک کے جواب میں وہ بھی اخلاقِ حسنہ اور حسنِ سلوک کو اپنانے کی ضرور کوشش کریں گی۔ نبی پاک ﷺ کے قول کے مطابق یہ عورتوں کا جہاد بھی ہے۔ وہ چاہے جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہوں یا الگ‘ گھر کے کام کاج کے بغیر گزارا نہیں ہے۔ (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مثال ہم سب کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو جنت کی عورتوں کی سردار ہیں)...... لیکن بہوؤں کے کام کاج کرنے پر ان کو دعائیں دینا اور ان کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے کہ مَنۡ لَّمۡ یَشۡکُرِ النَّاسَ لَا یَشۡکُرُ اللّٰہَ۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ”بیان القرآن“ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘ آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

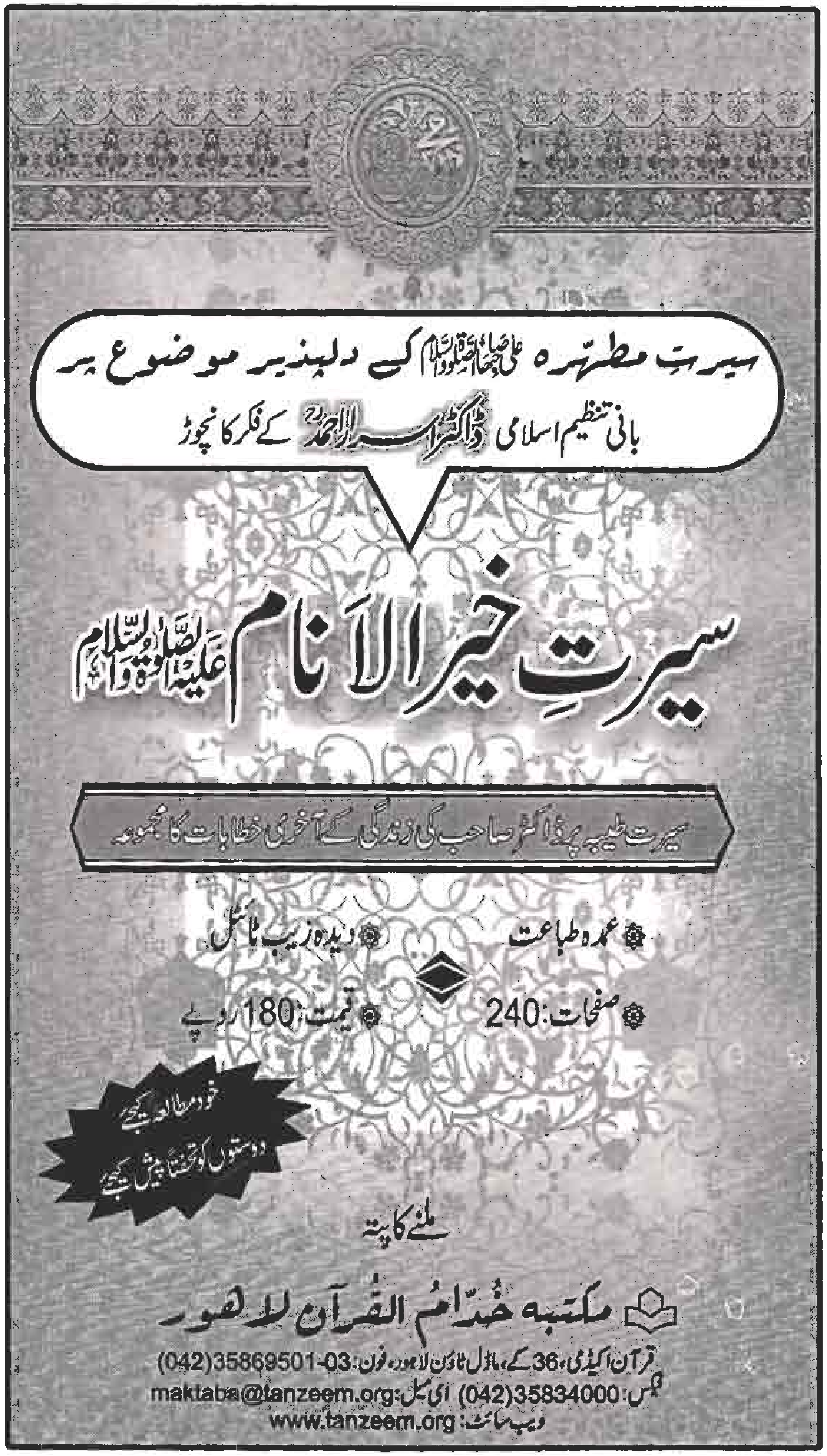

Dec.2015
vol. 64

Regd. CPL No. 115
No.12

Monthly **Meesaq** Lahore

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں :

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (III,II,I)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-35869501
Email: distancelearning@tanzeem.org